تعلیم و تربیت

جون 2010

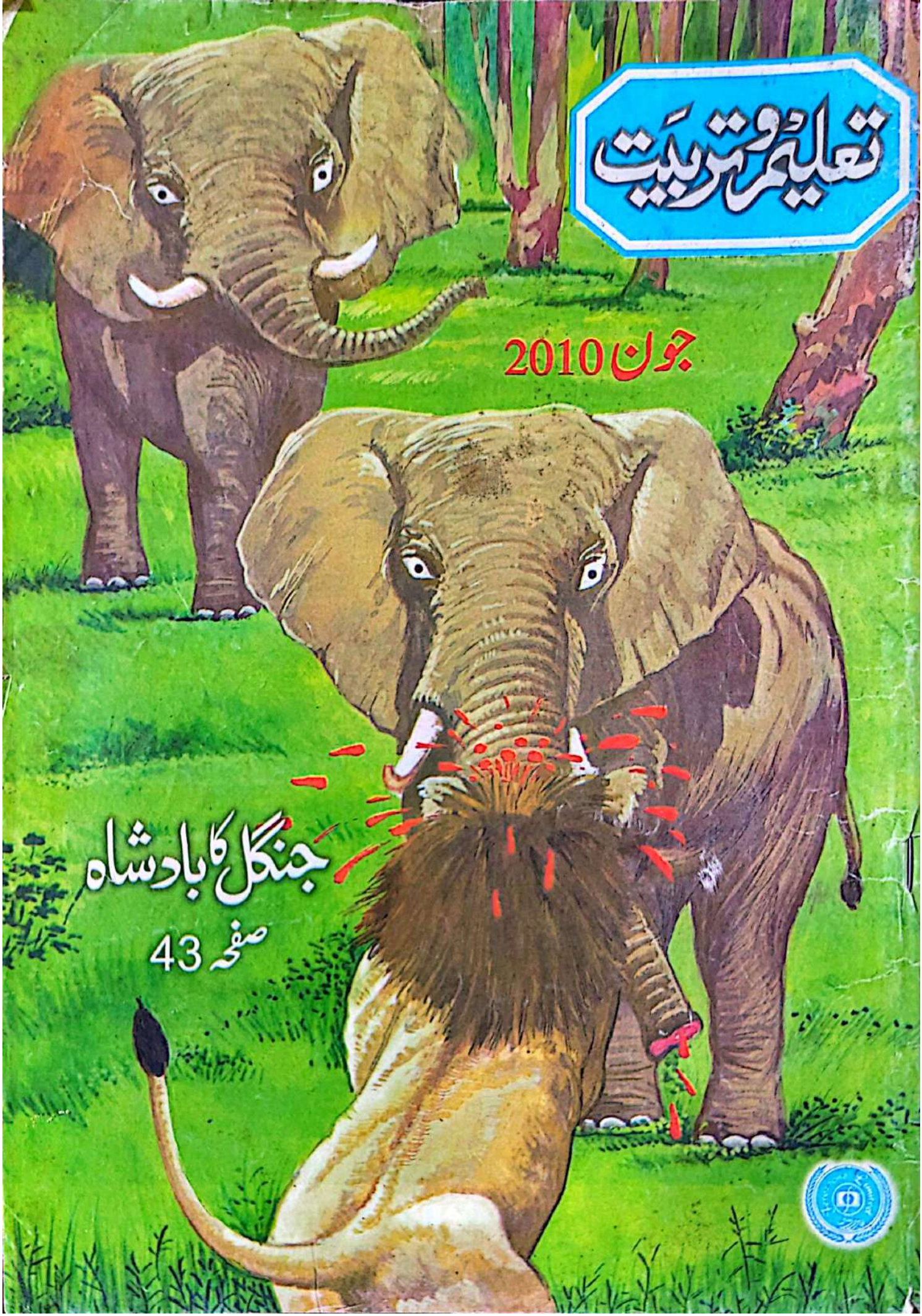

جنگل کا بادشاہ

صفحہ 43

Shezan
Twist
MANGO
BANANA
Shezan
Twist
STRAWBERRY
2 New
Flavors

70 واں سال دُوسرا شمارہ

(رکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی)

پاکستان میں سب سے زیادہ پڑھا جانے والا

تعلیم و تربیت

بچوں کا محبوب رسالہ

جون 2010ء

اس شمارے میں

اداریہ	مدیر	1
درسِ قرآن و حدیث	سید مقبول حسین شاہ	2
دُعا	ڈاکٹر خواجہ عابد نظامی	3
پہلا قدم	علی اکمل تصور	4
گرمی کی چھٹیاں	ضیاء الحسن ضیاء	8
مفید مشغلے	غلام حسین میمن	13
ایک نیا احساس	جدون ادیب	14
پناہ گاہ	وقار محسن	17
آپ بھی لکھئے	ہونہار ادیب	19
آمین	راشد علی	22
داؤدی علمی آزمائش	ذہین قارئین	24
دادا کی چھتری	نجمہ یاسمین یوسف	25
روشنی	محمد فاروق دانش	28
فائر بریگیڈ کی کہانی	نسرین شاہین	33
بچوں کا انسائیکلوپیڈیا	طارق ریاض خان	36
گولی	خلیل جبار	40
جنگل کا بادشاہ	محمد عارف عثمان	43
آپ کا خط ملا	ننھے قارئین	48
معمہ	صائمہ کامران	51
دوست ہو تو ایسا۔۔۔!	نذیر انبالوی	57
ہونہار مصور	ننھے مصور	62
میری زندگی کے۔۔۔	پُرعزم قارئین	63
بلا عنوان	ننھے خوشہ چیں	64

اور بہت سے دل چسپ تراشے اور سلسلے

سرورق: "جنگل کا بادشاہ"

قیمت فی پرچہ 25 روپے

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ!

اُمید ہے آپ سب خیریت سے ہوں گے۔

آپ سے ایک شکایت ہے، ہاں صرف ایک شکایت، آپ سوچئے بھلا وہ شکایت کیا ہو سکتی ہے۔ جس طرح آپ کو ہم سے بہت سی شکایات ہوتی ہیں، اِسی طرح ہمیں بھی آپ سے ایک شکایت ہے۔ ذرا غور کریں، شاید شکایت آپ کو خود بتا دے کہ ہمیں آپ سے کیا شکایت ہے، نہیں بھئی بات یوں نہیں بنے گی، شکایت کا کھوج تو آپ کو لگانا ہو گا۔ ہمیں بہت سے بچے کی آوازیں سنائی دے رہی ہیں کہ ہم نے ہار مان لی، اب بتا بھی دیجئے کہ آپ کو ہم سے کیا شکایت ہے، ہم تو اچھے بچے ہیں، اچھے اچھے کام کرتے ہیں پھر بھی آپ کو ہم سے شکایت ہے۔ ہاں تو سن لیجئے کہ ہمیں آپ سے کیا شکایت ہے، آپ میں سے اکثر بچے لکھتے ہیں کہ اگر اُن کا خط یا تحریر شائع نہیں ہوئی تو وہ "تعلیم و تربیت" پڑھنا چھوڑ دیں گے۔ آپ ہی بتائیے کیا یہ اچھی بات ہے؟ ہر وہ تحریر یا خط جو قابلِ اشاعت ہوتا ہے ضرور شائع کیا جاتا ہے۔ یہ تھی وہ اکلوتی شکایت جو ہمیں آپ سے تھی۔ ہمیں پھر آپ کی آوازیں سنائی دے رہی ہیں کہ انکل! ایسا آئندہ نہیں ہو گا۔ شاباش! یہی تو ہم چاہتے ہیں۔

اس ماہ سے تعلیمی اداروں میں موسمِ گرما کی چھٹیاں ہو رہی ہیں۔ آپ نے ہم سے ایک وعدہ کرنا ہے کہ ان چھٹیوں کو ضائع نہیں کریں گے بلکہ ان سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھائیں گے اور اُن مضامین جن میں آپ کمزور ہیں، اُن کی بہتر انداز میں تیاری کریں گے۔ ہم آپ کے لئے دُعا گو ہیں۔

اب آپ اس ماہ کا رسالہ پڑھیے اور اپنی آراء و تجاویز سے آگاہ کیجئے۔

خوش رہیں، شاد رہیں اور آباد رہیں

فی امان اللہ (ایڈیٹر)

چیف ایڈیٹر	ایڈیٹر، پبلشر	اسسٹنٹ ایڈیٹر	مشیر خاص	مشیر	سرکولیشن اسسٹنٹ
عبدالسلام	ظہیر سلام	نذیر انبالوی	سید مقبول حسین شاہ	سعید لخت	محمد بشیر راہی

سالانہ خریدار بننے کے لیے سال بھر کے شماروں کی قیمت پیشگی بنک ڈرافٹ یا منی آرڈر کی صورت میں سرکولیشن منیجر: ماہنامہ "تعلیم و تربیت" 32۔ ایبیر پریس روڈ، لاہور کے پتے پر ارسال فرمائیں۔

فون: 36361309-36361310 فیکس: 6278816

پرنٹر: ظہیر سلام
مطبوعہ فیروز سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ، لاہور۔
سرکولیشن اور اکاؤنٹس: 60 شاہراہ قائداعظم، لاہور۔

پاکستان میں (بذریعہ رجسٹرڈ ڈاک) = 500 روپے۔
مشرقِ وسطیٰ (ہوائی ڈاک سے) = 1250 روپے۔

ایشیاء، افریکا، یورپ (ہوائی ڈاک سے) = 1250 روپے۔
امریکا، کینیڈا، آسٹریلیا مشرقِ بعید (ہوائی ڈاک سے) = 1500 روپے۔

ماہنامہ تعلیم و تربیت 32۔ ایبیر پریس روڈ، لاہور
UAN: 042 - 111 62 62 62 Fax: 042 - 6278816
Email: tot.tarbiatfs@gmail.com
tot.tarbiatfs@live.com

ایک اچھے انسان کی نشانی یہ ہے کہ اُس کے قول اور فعل میں تضاد نہ ہو۔ وہ جو کچھ زبان سے کہے وہی اُس کے دل میں ہو اور ویسا ہی اُس کا عمل ہو۔ جو شخص زبان سے کچھ کہے اور اُس کے دل میں کچھ اور ہو تو یہ منافقت ہے اور ایسا شخص منافق ہے۔ ایک اچھا انسان وہ ہے جو ہمیشہ سچ بولے اور جس پر لوگ اعتماد کر سکیں۔ ایسے شخص کو لوگ عزت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کو منافقت سخت ناپسند ہے اور اِس کی بہت بڑی سزا ہے۔ قرآن مجید میں ہے:

سورۂ توبہ آیت ۶۸: "اللہ نے منافق مردوں اور منافق عورتوں اور کافروں سے جہنم کی آگ کا وعدہ کیا ہے جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ اُن کے لیے بس یہی ہے اور اللہ نے اُن پر لعنت کی ہے اور اُن کے لیے ہمیشہ کا عذاب ہے۔"

رسُول کریمؐ نے ہر قسم کی منافقت سے منع فرمایا ہے۔ صحیح حدیث میں ہے:

رسُول کریمؐ نے فرمایا: "چار خصلتیں ایسی ہیں جو اگر سب کی سب کسی شخص میں ہوں تو وہ پورا منافق ہے اور جس شخص میں اُن میں سے کوئی ایک خصلت پائی جائے گی تو اُس میں نفاق (یعنی منافقت) کی ایک صفت ہو گی جب تک کہ اُس کو ترک نہ کر دے:

1۔ اگر اُس کے پاس امانت رکھی جائے تو خیانت کرے۔
2۔ جب بات کرے تو جھوٹ بولے۔
3۔ اگر عہد کرے تو دھوکہ دے۔
4۔ جب جھگڑے تو بدگوئی کرے۔ (یعنی گالیاں دے)

(صحیح بخاری کتاب ۲۔ باب ۲۴: صحیح مسلم کتاب الایمان۔ باب ۲۳)

غصہ کی حالت میں بدگوئی کرتے ہوئے ایسی باتیں کہہ دی جاتی ہیں جو غلط ہوتی ہیں اور جن سے دُوسروں کو غلط تاثر ملتا ہے۔ چنانچہ یہ منافقت ہے۔ ایک اچھا انسان امانت میں خیانت نہیں کرتا، وہ جھوٹ نہیں بولتا، وہ غلط عہد نہیں کرتا اور غصہ آنے پر بُری اور غلط باتیں منہ سے نہیں نکالتا۔

دُنیا کی تاریخ میں ایک ایسا اعلیٰ پائے کا وکیل اور سیاست دان ہوا ہے جس نے زندگی بھر کبھی جھوٹ نہیں بولا، کبھی بدعہدی نہیں کی، کبھی غلط یا بُری بات منہ سے نہیں نکالی۔ ہم سب کو فخر ہے کہ یہ انتہائی عظیم انسان حضرت قائداعظم محمد علی جناح تھے۔ ہمارے لئے وہ ایک روشن اور درخشاں مثال ہیں۔

ایک بات بہت اہم ہے۔ جب ہم نماز پڑھتے ہیں تو اُس وقت ہم اللہ تعالیٰ کے دربار میں ہوتے ہیں۔ ہم اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا یعنی تعریف کرتے ہیں، ہم اقرار کرتے ہیں کہ سارے جہانوں کا پالنے والا اللہ ہے، ہمیں جو کچھ بھی ملتا ہے اُسی پاک ہستی سے ملتا ہے۔ ہم اللہ ہی کی عبادت کرتے ہیں اور اُسی سے مدد مانگتے ہیں۔ ہم سیدھے راستے پر چلنے کی دُعا مانگتے ہیں، اُن لوگوں کے راستے پر چلنے کی جن سے اللہ تعالیٰ خوش ہوا اور اُن کو انعام واکرام سے نوازا۔ اگر ہم یہ سب باتیں دل سے نہیں کہتے، محض زبان سے ادا کرتے ہیں تو یہ منافقت ہے۔ قرآن مجید میں ہے:

سورۂ النساء آیت ۱۴۲: "منافق (نماز پڑھتے ہوئے) اللہ کو دھوکا دیتے ہیں اور وہ اُن کو دھوکے میں ڈالے گا (کہ صحیح نماز پڑھ رہے ہیں)۔ اور جب یہ نماز کو کھڑے ہوتے ہیں تو جی ہارے ہوئے اور لوگوں کو دکھانے کے لئے کھڑے ہوتے ہیں اور اللہ کو یاد نہیں کرتے مگر تھوڑا سا۔"

اِسی طرح قرآن مجید اور صحیح احادیث سے اگر کوئی شخص راہنمائی حاصل نہیں کرتا اور کسی کی ایسی بات کو جو قرآن مجید سے مطابقت نہیں رکھتی درست سمجھتا ہے تو وہ جہنم کا راستہ اختیار کرتا ہے۔ مسلمان کا مطلب ہے اللہ تعالیٰ کا فرمانبردار۔ جو شخص قرآن مجید کو سمجھ کر پڑھتا ہے اور اُس پر عمل کرتا ہے وہ مسلمان کہلا سکتا ہے۔ ایسے شخص کو کوئی گمراہ نہیں کر سکتا۔ اگر وہ ایسا نہیں کرتا اور دُوسروں کی غلط باتوں میں آجاتا ہے تو وہ منافق ہے، وہ مسلمان نہیں کہلا سکتا کیونکہ وہ اللہ کا فرمانبردار نہیں، وہ کسی اور کا فرمانبردار ہے۔ ایسا شخص جہنمی ہے۔

پیارے بچو! آیئے عہد کریں کہ ہم نماز سمجھ کر ادا کریں گے، قرآن مجید سمجھ کر پڑھیں گے۔ منافقت سے بچیں گے اور بحیثیت ایک مسلمان کے اللہ تعالیٰ کے فرمانبردار بن کر زندگی بسر کریں گے۔ آمین۔

دُعا

یا اللہ یا رحمان ہم کو بنا اچھا انسان
اچھے اچھے کام کریں جگ میں روشن نام کریں
کام ہمارا خدمت ہو اِس کی ہم کو عادت ہو
ادب کریں ماں باپ کا ہم پہنچائیں نہ اُن کو غم
بوڑھوں کی تعظیم کریں اُن سے خوب دُعائیں لیں
صحت کا بھی خیال رکھیں یوں دُنیا میں آگے بڑھیں
یا رب ہو مقبول دُعا جگ میں تُو ہے سب سے بڑا

ڈاکٹر خواجہ عابد نظامی، لاہور

پہلا قدم

علی اکمل تصور (قصور)

گھر میں داخل ہونے والے بچے کے ہاتھ میں ایک کٹوری دبی ہوئی تھی۔ وہ خوف زدہ تھا۔ وجہ یہ تھی کہ وہ خالی ہاتھ آتا تھا اور خالی ہاتھ ہی لوٹ جاتا تھا، لیکن اُس کی امی تھی کہ بات سمجھتی ہی نہیں تھی۔ ہفتے میں ایک دو بار تو وہ ضرور اپنے بچے کو چچا رب نواز کے ہاں بھیجتی تھی۔ بچہ واپس جا کر اپنی امی کو کبھی نہیں بتاتا تھا کہ اُس کے ساتھ کیا ہوا اور آج پھر وہی ہونے والا تھا۔ ذلیل ہونے کے احساس نے اُسے خوف زدہ کر رکھا تھا..... دھتکار تو جانور کے دل پر بھی اثر کرتی ہے۔ انسان کے لیے تو پھر بڑی بات ہے۔ اُس کے پاس سب سے بڑا سرمایہ اُس کی انا ہوتی ہے۔

بچے کو دیکھ کر رب نواز کے چہرے کے تاثرات بگڑ گئے تھے۔

"کیا ہے؟" وہ سخت لہجے میں بولا۔

"چچا..... وہ..... میری امی نے بھیجا ہے....." بچہ بولا۔

"ہاں تو پھر....." رب نواز اچھی طرح جانتا تھا کہ بچہ کیوں آیا ہے۔ لیکن پھر بھی وہ پوچھ رہا تھا۔

"امی کہہ رہی ہے کہ تھوڑا سالن دے دیجئے....." اتنے میں رب نواز کی بیوی بھی پاس آگئی تھی۔ رب نواز کو غصہ آگیا تھا۔ لیکن اپنی بیوی کو دیکھ کر وہ خاموش رہا۔ رب نواز کی بیوی الجھن میں پڑ گئی تھی کہ وہ بچے کی مدد کرے یا پھر اپنے شوہر کی رضا کا خیال کرے۔ رب نواز نے اُسے اشارہ کر دیا تھا۔ وہ مجبور ہو گئی۔

"بیٹا! سالن تو بنایا تھا لیکن ختم ہو گیا....." بچہ جلدی سے واپسی کے لیے پلٹ گیا۔ وہ کوئی کڑوی بات سننے سے بچنا چاہتا تھا، لیکن دروازے تک پہنچتے پہنچتے آواز اُس کے کانوں تک پہنچ ہی گئی۔

"اُس کے سامنے تم نے جھوٹ کیوں بولا....." رب نواز اپنی بیوی پر ناراض ہو رہا تھا۔

"کہہ دیتی کہ ہم سالن اپنے کھانے کے لیے بناتے ہیں۔ لوگوں میں تقسیم کرنے کے لیے نہیں..... جسے دیکھو منہ اٹھائے چلا آتا ہے....."

"بچہ ہے اُس کا دل ٹوٹ جاتا۔ آپ اُس کی ضرورت پوری نہیں کرنا چاہتے نا سہی لیکن اُس معصوم کا دل تو نہ توڑیں....." اس کے لہجے میں درد تھا۔ بچہ اپنے آنسو صاف کرتا ہوا گھر سے باہر نکل گیا۔

کھانے کے بعد جو سالن بچ جائے اُسے سنبھال کر رکھ لینا صبح ناشتے میں کام آجائے گا....." رب نواز اپنی بیوی کو مشورہ دے رہا تھا۔

"جی اچھا۔" اُس کی بیوی نے مختصر جواب دیا۔ اُسے غصہ

آرہا تھا۔ اُسے اپنے شوہر کی یہ عادت اچھی نہیں لگتی تھی۔ آنے والا اپنے ساتھ اُمید لے کر آتا ہے۔ کسی کی اُمید کو یوں توڑ دینا اُسے پسند نہیں تھا۔ اللہ تعالیٰ نے رزق دیا ہے تو اُس میں اُس کی مخلوق کا حصہ بھی موجود ہے۔ لیکن وہ یہ بات اپنے شوہر کو کیسے سمجھاتی۔ رب نواز کی اپنی ایک دُنیا تھی۔ جس میں وہ خود غرضی اور مفاد پرستی کے ساتھ رہتا تھا۔ یہ صرف ایک بچہ نہیں تھا جس کے ساتھ اس نے بُرا سلوک کیا تھا۔ رب نواز تو ہر ایک کے ساتھ ایسا ہی سلوک کرتا تھا۔ یہ دُنیا تو ایک امتحان گاہ ہے۔ اللہ تعالیٰ دیکھنا چاہتا ہے کہ اُس نے اپنے انسانوں کو جو اختیارات دیے ہیں وہ انہیں کیسے استعمال کرتے ہیں۔ رب نواز تو شاید اپنے نام کا بھی مفہوم نہیں جانتا تھا۔ رب بھی انہی انسانوں کو نوازتا ہے جو اُس کی مخلوق کو نوازتے ہیں۔

اگلی صبح ہنگامہ ہو گیا۔ رات کو بچنے والا سالن خراب ہو گیا تھا۔ ناشتے کے وقت رب نواز نے سالن کھانا چاہا تو اُس میں سے بو آرہی تھی۔ رات کو گرمی کچھ زیادہ ہی تھی۔ اُس کے ہاں فریج موجود نہیں تھا۔

"میں نے تو سالن والا برتن احتیاط سے کھلی ہوا میں رکھا تھا....."

"بے وقوف..... رحمت خان کے گھر فریج موجود ہے تم وہاں سالن نہیں رکھ سکتی تھی....."

"ہاں رکھ سکتی تھی، لیکن جب ہم کسی کے کام نہیں آتے تو کسی سے کام لینے کی اُمید کیوں رکھیں۔" بیوی کی بات سن کر رب نواز لاجواب ہو گیا۔

"بہتر ہوتا ہم اُس بچے کو سالن دے دیتے۔ مفت میں گھر آئی نیکی کو برباد کر دیا....."

رب نواز خاموش تھا۔ پھر بچے سکول اور رب نواز کام پر چلا گیا۔ دوپہر کو وہ گھر لوٹا تو ایک خط اس کا منتظر تھا۔ یہ خط اُس کی بڑی بہن کا تھا۔ وہ اپنی بیٹی کی شادی کر رہی تھی۔ اور اُسے شادی میں شرکت کے لیے بلایا تھا۔ رب نواز کی بہن نے شکوہ کیا تھا کہ وہ موبائل فون کیوں نہیں لے لیتا تاکہ بات کرنے میں آسانی ہو جائے۔ اگلے ماہ شادی تھی۔ پھر رب نواز تیاری میں لگ گیا۔

پھر وہ دن بھی آ گیا جب رب نواز اپنی بیوی اور بچوں کے ہمراہ ریلوے پلیٹ فارم پر موجود تھا۔ آج انہیں ٹرین کے ذریعے دُوسرے شہر روانہ ہونا تھا۔ خوش قسمتی سے رب نواز کو سیٹیں مل گئی تھیں۔ ٹرین کی روانگی میں ابھی وقت تھا۔ رب نواز اٹھ کھڑا ہوا۔

"میں ابھی آیا....."

"آپ کہاں جا رہے ہیں؟" اُس کی بیوی پریشان ہو گئی۔

"فکر مت کرو۔ میں اپنی بہن کو اطلاع دے دوں کہ ہم پہنچ رہے ہیں۔ وہ کسی کو اسٹیشن پر بھیج دے گی تو ہم سہولت سے اُس کے گھر پہنچ جائیں گے....."

اتنا کہہ کر وہ پلیٹ فارم پر اتر آیا۔ اب اُسے پی۔ سی۔ او کی تلاش تھی۔ ایسے میں اُس نے ایک نوجوان کو دیکھا اُس کے ہاتھ میں موبائل فون تھا اور وہ پلیٹ فارم پر ٹہل رہا تھا۔ کچھ سوچ کر رب نواز اُس کے پاس گیا۔

"بھائی! مجھے ایک فون کرنا ہے۔" یہ سن کر نوجوان چونک اٹھا۔ اُس نے گہری نظروں سے رب نواز کی طرف دیکھا اور بولا۔

"جناب! آپ اجنبی ہیں اور میں فون اجنبیوں کے حوالے نہیں کرتا....."

"وہ کیوں؟" رب نواز کو بات سمجھ نہیں آئی تھی۔ وہ احمق تھا۔ تیز رفتاری کے اِس دور میں ایک تو اُس نے موبائل فون رکھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ دُوسرا وہ اُن احتیاطوں سے آگاہ نہیں تھا جو موبائل استعمال کرنے والے کو اختیار کرنی چاہیے۔

"ہو سکتا ہے کہ آپ ڈاکو ہوں، ہو سکتا ہے کہ آپ دہشت گرد ہوں۔ موبائل میں موجود سم میرے نام پر ہے۔ آپ میرے نمبر سے بات کریں اور میں کسی حادثے کے نتیجے میں پکڑا جاؤں۔ مجھے تو معاف ہی کیجئے۔"

وہ نوجوان معذرت کر کے آگے بڑھ گیا۔ رب نواز حیرت سے اُسے دیکھتا ہی رہ گیا۔ کچھ بات اُس کی سمجھ میں آئی تھی، کچھ نہیں آئی تھی۔ ٹرین کی روانگی کا وقت ہو گیا تھا۔ وہ

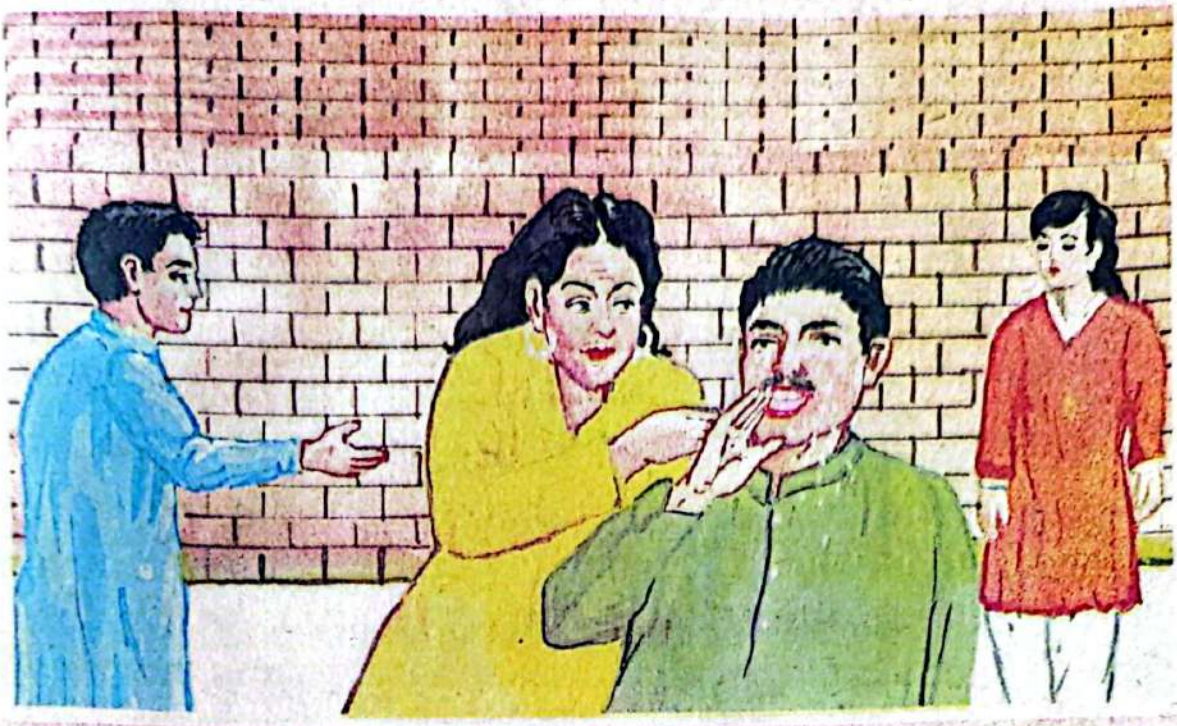

ٹرین کے دروازے میں آ کر کھڑا ہو گیا۔ رب نواز کو ٹرین میں موجود دیکھ کر اُس کی بیوی مطمئن ہو گئی تھی۔ پھر ٹرین پٹری پر سرکنے لگی، ہر گزرتے لمحے کے ساتھ اُس کی رفتار میں تیزی آ رہی تھی۔ رب نواز دیکھ رہا تھا ایک نوجوان تیزی کے ساتھ ٹرین کی طرف دوڑ رہا تھا۔ یہ وہی نوجوان تھا جس نے رب نواز کو موبائل فون کے حوالے سے احتیاط کے متعلق بتایا تھا۔ وہ نوجوان ٹہلتے ہوئے شاید دُور نکل گیا تھا۔ اور اب وہ ٹرین کو پکڑنا چاہتا تھا۔ اُس کی مدد کے لیے رب نواز نے ہاتھ بڑھا دیا تھا۔ یہ عجیب بات تھی۔ رب نواز اپنی فطرت کے خلاف کام کر رہا تھا۔ لیکن ایسا شاید وہ لاشعوری طور پر کر رہا تھا۔ اُس نوجوان نے رب نواز کا ہاتھ تھام لیا تھا۔ پھر وہ ایک چھلانگ لگا کر ٹرین میں سوار ہو گیا۔ اس افراتفری میں اُس کا ایک جوتا پلیٹ فارم پر گر گیا۔ اب اُس کے صرف ایک پاؤں میں جوتا موجود تھا۔ ایک لمحے سے بھی کم وقت میں اُس نے کچھ سوچا اور پھر اپنا دُوسرا جوتا بھی پاؤں سے نکال کر پلیٹ فارم پر پھینک دیا۔ رب نواز حیران ہو رہا تھا کہ ایک جوتا تو حادثاتی طور پر پلیٹ فارم پر رہ گیا۔ دُوسرا نوجوان نے خود کیوں پھینک دیا۔ یہ کیا بات ہوئی۔ وہ نوجوان رب نواز کی ذہنی کیفیت کو بھانپ گیا تھا۔ وہ پُر سکون انداز میں بولا۔

"جناب! میرے پاؤں میں موجود ایک جوتا اب میرے کسی کام کا نہیں تھا۔ پلیٹ فارم پر گرنے والا جوتا کسی کو ملتا تو وہ اس کے کام کا نہ ہوتا۔ اس لیے میں نے دُوسرا جوتا بھی باہر پھینک دیا تاکہ جس کو ملے وہ انہیں استعمال کرنے کے قابل ہو جائے۔"

اتنا کہہ کہ وہ نوجوان آگے بڑھ گیا۔ رب نواز اُسے یوں دیکھ رہا تھا کہ جیسے وہ کسی دُوسری دُنیا کی مخلوق ہو۔ ایک وہ نوجوان تھا اور ایک رب نواز تھا۔ وہ تو طلب کرنے پر بھی کسی کی ضرورت پوری نہیں کرتا تھا۔ اور ایک یہ نوجوان تھا۔ رب نواز کو یوں محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے اُس کے وجود میں کوئی چیز ٹوٹ رہی ہو۔

پانچ گھنٹے کے طویل سفر کے بعد رب نواز بیوی بچوں کے ہمراہ اپنی منزل پر پہنچ گیا۔ شادی بھی خوش اسلوبی کے ساتھ اپنے انجام کو پہنچ گئی، لیکن رب نواز اب زیادہ تر خاموش رہتا تھا۔ یہ تبدیلی اُس کی بیوی بھی محسوس کر رہی تھی۔ لیکن رب نواز سے کچھ پوچھنے کی اس میں ہمت نہیں تھی۔ رب نواز

اپنے گھر واپس لوٹ آیا تھا۔ زندگی معمول کے مطابق گزر رہی تھی۔

ایک شام رب نواز کسی سوچ میں گم چارپائی پر لیٹا ہوا تھا۔ اُس کی بیوی رات کے کھانے کے لیے سالن بنا رہی تھی۔ رب نواز کا بیٹا اپنا ہوم ورک یاد کرنے میں مصروف تھا۔ رب نواز نے غور کیا۔ بچہ ایک قرآنی سورت کا ترجمہ اور مطلب یاد کر رہا تھا۔

"کھڑکھڑانے والی اور تم کیا جانو..... کھڑکھڑانے والی کیا ہے، یہ تو آگ ہے، جہنم کی دھکتی ہوئی آگ، اُن لوگوں کے لیے جو یتیم کو دھتکارتے ہیں، جو نماز نہیں پڑھتے اور جو حق داروں کو مانگنے پر بھی استعمال کی چیزیں نہیں دیتے۔"

رب نواز کے جسم پر کپکپی طاری ہو گئی۔ آنکھوں کے سامنے موجود منظر دھندلانے لگا۔ اُسے آج پہلی بار معلوم ہوا تھا کہ وہ اپنے لیے دوزخ کی کھڑکھڑاتی آگ کا انتخاب کر رہا ہے۔ اِس احساس نے اُس کے دل کی حالت کو بالکل بدل کر رکھ دیا اور پھر..... رب نواز پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ آج اُسے ان تمام سوالوں کے جوابات مل گئے تھے جو اُس کا ضمیر اُس سے پوچھ رہا تھا۔ گھر کے تمام افراد اُس کے گرد جمع ہو گئے تھے۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ ماجرا کیا ہے۔ پھر رب نواز اٹھ کھڑا ہوا۔

"سالن تیار ہو گیا ہے۔" وہ اپنی بیوی سے پوچھ رہا تھا۔

"جی ہاں....." وہ بے چاری پریشان ہو کر بولی۔

"ایک برتن میں تھوڑا سالن نکال دو۔ مجھے کہیں جانا ہے۔"

ایک لمحے میں رب نواز کی بیوی ساری بات سمجھ گئی۔ اُس کا شوہر جنت حاصل کرنے والے راستے پر پہلا قدم رکھنے والا تھا۔ وہ مسکرانے لگی۔ اُس نے جلدی سے سالن والا برتن رب نواز کے حوالے کر دیا۔ رب نواز گھر سے نکلا اب وہ اُس بچے کے گھر کی طرف قدم اٹھا رہا تھا جو ہمیشہ اُس کے گھر سے مایوس لوٹتا تھا۔ پہلا موڑ کاٹتے ہی اُس بچے کا گھر آگیا۔ وہ دروازے پر کھڑا ہو گیا۔ اب وہ اُس دروازے پر دستک دینے کی ہمت جمع کر رہا تھا۔ اتنے میں گھر کے اندر سے ایک عورت کی آواز اُس کے کانوں سے ٹکرائی۔

"بیٹا! میں کتنی دیر سے کہہ رہی ہوں کہ رب نواز کے ہاں سے اپنے لیے سالن لے آؤ۔ اُس کی بیوی میری سہیلی ہے۔ وہ تمہیں مایوس نہیں کرے گی....."

"میں نہیں جاؤں گا....." بچے نے انکار کر دیا۔

"بیٹا! میں جہاں کام کرتی ہوں وہاں سے آج مجھے اجرت نہیں ملی۔ آٹا گھر میں ہوتا تو میں روٹی بنا دی ہے۔ سالن لے آؤ اور کھانا کھالو۔ صبح پیسے مل جائیں گے تو میں گھر میں سالن بنا دوں گی، ضد نہ کرو اور جاؤ....."

رب نواز جانتا تھا کہ اِس عورت کا شوہر وفات پا چکا ہے۔ رب نواز کا دل کٹ کر رہ گیا۔ آج اُسے معلوم ہوا تھا کہ وہ بچہ کتنی بے بسی کے عالم میں اس کے گھر سالن مانگنے آتا تھا۔ وہ بچہ مسلسل انکار کر رہا تھا۔

"میں نہیں جاؤں گا امی..... میں روٹی پر نمک مرچ لگا کر پانی کے ساتھ نگل لوں گا، لیکن چچا رب نواز کے ہاں نہیں جاؤں گا....."

بچے کی بات سن کر ایک بار پھر رب نواز کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ رب نواز کو پہلی بار احساس ہوا تھا کہ دُنیا میں کتنا غم ہے اور اس غم کو سخاوت کے ذریعے کم کیا جاسکتا ہے۔ سب سے مشکل کام تنگ دستی میں سخاوت کرنا ہے۔ اور یہ اللہ کی پاک ذات کے ساتھ ایسا سودا ہے کہ جس میں منافع بہت زیادہ ہے۔ اب رب نواز کے لیے رکنا مشکل تھا۔ اُس نے دروازے پر دستک دی۔

"دیکھو بیٹا! دروازے پر کون ہے....." وہ بچہ دروازے پر آیا اور پھر رب نواز کو دیکھ کر خوف زدہ ہو گیا۔

"یہ لو بیٹا! سالن لے لو۔"

رب نواز نے برتن اس بچے کی طرف بڑھا دیا۔ بچے نے پہلے رب نواز اور پھر برتن کی طرف دیکھا۔ ایک دم آنسو اُمڈ کر بچے کی آنکھوں میں آگئے تھے۔ یہ آنسو دیکھنے کی رب نواز میں ہمت نہیں تھی۔ وہ برتن بچے کے حوالے کر کے واپس لوٹ آیا۔ اب وہ بہت مطمئن اور پُر سکون تھا۔ دوزخ کی کھڑکھڑانے والی آگ سے اب اُسے کوئی خوف نہیں تھا۔ کیوں کہ اُس نے جنت کی طرف جانے والے راستے پر پہلا قدم جو رکھ دیا تھا۔

گرمی کی چھٹیاں

مِل جُل کر آؤ کھیلیں گرمی کی چُھٹیاں ہیں
کچھ اپنے ہی گھروں میں پکنک منا رہے ہیں
کاغان اور مری کو کچھ دوست جا رہے ہیں
کیسے مزے نہ لوٹیں گرمی کی چُھٹیاں ہیں
مِل جُل کے آؤ کھیلیں گرمی کی چُھٹیاں ہیں
شدت کی دُھوپ ہو تو باہر نہ گھر سے نکلیں
اپنے گھروں میں بیٹھیں، اپنے گھروں میں کھیلیں
یا گھر میں جھولا جھولیں گرمی کی چُھٹیاں ہیں
مِل جُل کے آؤ کھیلیں گرمی کی چُھٹیاں ہیں
جو ہوم ورک تم کو اُستاد نے دیا تھا
یہ دن گزر نہ جائیں رہ جائے وہ ادھورا
پہلے وہ کام کر لیں گرمی کی چُھٹیاں ہیں
مِل جُل کے آؤ کھیلیں گرمی کی چُھٹیاں ہیں
دُہرائیں روز اُن کو اسباق جو پڑھے تھے
ضائع نہ چھٹیاں ہوں کوئی نہ ہم کو ٹوکے
پچھلا سبق نہ بھولیں گرمی کی چُھٹیاں ہیں
مِل جُل کے آؤ کھیلیں گرمی کی چُھٹیاں ہیں

ضیاء الحسن ضیاء، کراچی

میرے پسندیدہ اشعار

آپ کے پسندیدہ اشعار پر مبنی "تعلیم و تربیت" کا لیا دل جسپ سلسلہ

تُو ہے سورج تجھے کہاں معلوم رات کا دکھ
کسی روز میرے گھر میں اتر شام کے بعد
(ہارون الرشید، جہلم)

سفر کٹھن ہی سہی جان سے گزرنا کیا
جو چل پڑے ہیں تو اب رلو میں ٹھہرنا کیا
(دامنِ زہرا، اسلام آباد)

یہ ایک ابر کا ٹکڑا کہاں کہاں برسے
تمام دشت ہی پیاسا دکھائی دیتا ہے
(جویریہ خٹک، کوہاٹ)

وہی زمانے کی گردش پہ غالب آتا ہے
جو ہر نفس سے کر لے عمر جاوداں پیدا
(میر باز خان، چکوال)

دے رزق ہر بشر کو میرے رب کائنات
اتنا تو ہو کہ بھیک نہ مانگا کرے کوئی
(ایاز احمد کاشر، چکوال)

ازل سے رچ گئی ہے سربلندی اپنی فطرت میں
ہمیں کٹنا تو آتا ہے مگر جھکنا نہیں آتا
(عاطف نذیر، جہلم)

ہوئی ہے جب سے مخالف ہوا زمانے کی
مجھے بھی ضد سی ہوئی ہے دیا جلانے کی
(عبدالرشید، ہنگو)

دُور تک چھائے تھے بادل اور کہیں سایہ نہ تھا
اس طرح برسات کا موسم کبھی آیا نہ تھا
(قمر ناز دہلوی، کراچی)

نہ مانگ ایک بھی لمحہ خوشی کا دُنیا سے
یہ قرض وہ ہے جسے عمر بھر اتارے گا
(شہزاد محسن خٹک، پشاور)

فٹ پاتھ کی دیوار سے چپکے ہوئے پتے
اِک روز ہواؤں کو درختوں پہ ملے تھے
(سلمیٰ صفی، ٹمن)

میں ایک دن ظلم کے چہرے کو نوچ ڈالوں گا
میرے ہاتھوں میں جگنو ہیں، اندھیرا کچھ نہیں کہتا
(سمیع اللہ، کراچی)

کس کو فرصت ہے دھواں دیکھنے جائے محسن
جھونپڑی شہر سے کچھ دُور جلی ہے اب کے
(حسن رضا سردار، کامونکی)

اپنے کردار میں پیدا کرو اخلاص و وفا
دل نہیں جھکتے کبھی طاقتِ شمشیر کے ساتھ
(عبداللہ اشرف، گوجرانوالہ)

اے طائرِ لاہوتی! اس رزق سے موت اچھی
جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی
(محمد تنویر انگراء، پیلووینس)

ہوتی اگر خون کے رشتوں میں وفا
تو یوسف بکتا نہ مصر کے بازاروں میں
(فرخ حیات، پیر محل)

میرے ہاتھوں اور ہونٹوں سے خوشبو جاتی نہیں
کہ میں نے اسمِ محمدؐ لکھا بہت اور چوما بہت
(عروہ یونس، لاہور)

نالۂ آخرِ شب کس کو سناؤں ناصر
نیند پیاری ہے میرے دیس کے فنکاروں کو
(عاقب روانہ، کوٹ مومن)

پیڑ کو دیمک لگ جائے یا آدم زاد کو غم
دونوں ہی کو امجد ہم نے بچتے دیکھا کم
(شیخ ثقلین علی، اسلام آباد)

مفلسی میں شوق تھا ہر چیز میرے پاس ہو
جیب میں پیسے ہیں تو ذوقِ خریداری نہیں
(قراۃ العین، اسلام آباد)

ہم تو دشمن کو بھی پاکیزہ سزا دیتے ہیں
ہاتھ اٹھاتے نہیں نظروں سے گرا دیتے ہیں
(راحت اسلم، گوجرانوالہ)

ہنسنے کی آرزو میں دبایا جو درد کو
آنسو ہماری آنکھ میں پتھر کے ہو گئے
(کائنات فاطمہ، گجرات)

میرا طریق امیری نہیں فقیری ہے
خودی نہ بیچ غریبی میں نام پیدا کر
(محمد اکبر جاوید سرکانی، ڈیرہ اسماعیل خان)

آدم کے کسی روپ کی تحقیر نہ کرنا
پھرتا ہے زمانے میں خدا بھیس بدل کر
(غلام جیلانی، جہلم)

یارانِ جہاں کہتے ہیں، کشمیر ہے جنت
جنت کسی کافر کو ملی ہے نہ ملے گی
(فصیحہ اشرف، مرید کے)

فاصلہ ہو تو نظر آتے ہیں پھولوں کی طرح
جانے کیوں نزدیک آکر خار بن جاتے ہیں لوگ
(عروج احسان، کوہاٹ)

خزاں نصیب یہ سمجھے کہ آ گئی ہے بہار
حفیظ جب بھی چمن سے بہار گزری ہے
(نور فرید، کراچی)

م	د	ط	ش	ز	ق	ن	چ	ک	ٹ
ر	ق	ف	د	ر	ل	ز	ع	ر	ک
ک	ت	ا	ب	ٹ	م	ب	م	س	ی
ع	گ	ت	ڑ	و	غ	گ	ا	ی	ف
ج	ر	ا	ب	ی	ی	ت	ف	ج	ر
ل	ش	خ	ر	پ	ر	ا	ت	و	ج
س	غ	ف	و	م	ا	و	ک	ن	ف
ض	ے	ل	م	ک	م	ک	م	ب	ل
ر	ظ	ص	ا	س	ل	ا	ا	د	ر
ب	خ	ش	ل	ن	ا	ن	ز	ی	م

آپ نے حروف ملا کر دس چیزیں تلاش کرنی ہیں۔ آپ ان چیزوں کو دائیں سے بائیں، بائیں سے دائیں اُوپر سے نیچے اور نیچے سے اوپر تلاش کر سکتے ہیں۔ آپ کے پاس وقت دس منٹ کا ہے۔ جن چیزوں کو آپ نے تلاش کرنا ہے ان کے نام یہ ہیں۔

قلم۔ کتاب۔ کمپیوٹر۔ میز۔ کرسی۔ کمبل۔ رومال۔ الماری۔ جراب۔ جوتا

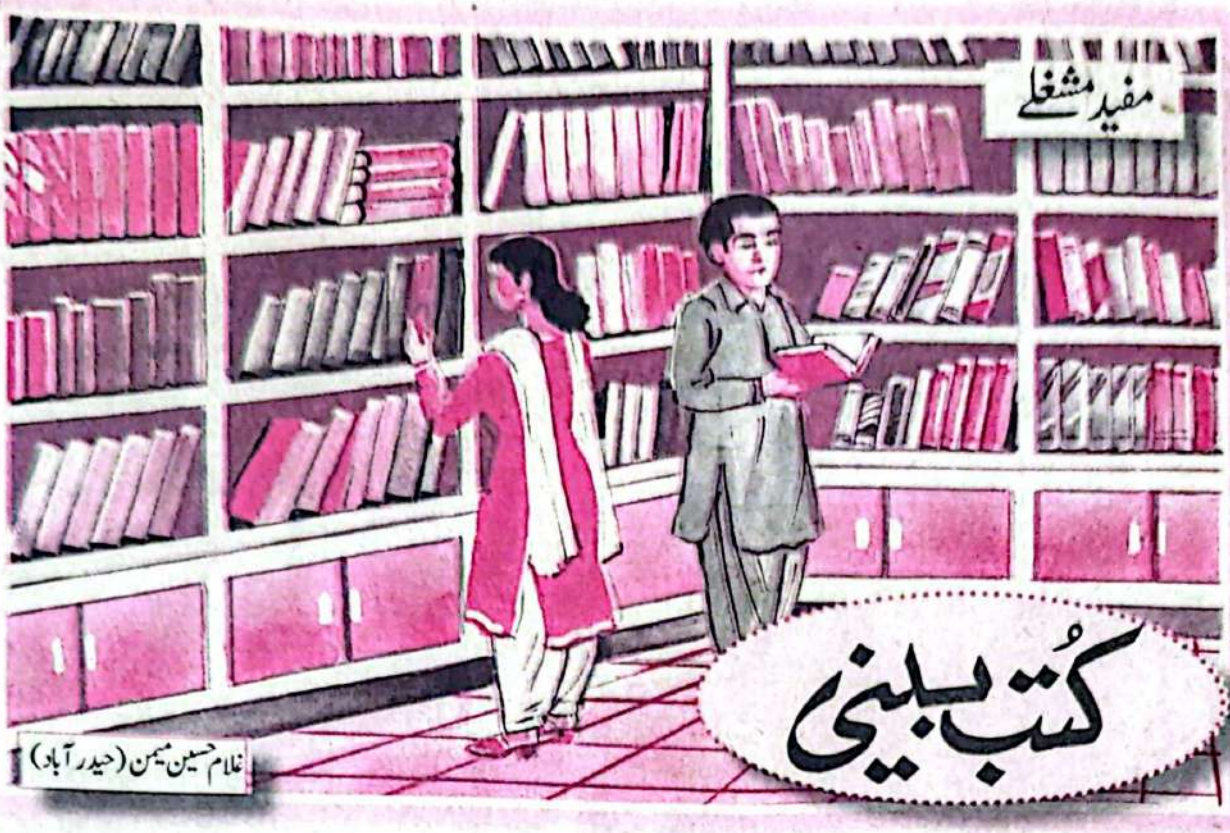

کُتب بینی

غلام حسین میمن (حیدر آباد)

بیٹھ کر سیر دو جہاں کرنا
یہ تماشا کتاب میں دیکھا

کہا جاتا ہے کہ اچھی کتاب سے بڑھ کر کوئی تحفہ نہیں۔ ہم مسلمانوں پر اللہ تعالیٰ کا کتنا بڑا احسان ہے کہ ہم آخری نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے امتی ہیں اور اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید جیسی کتاب نازل فرما کر رہتی دُنیا تک کے لیے ہدایت کا سامان کر دیا۔ قرآنِ مجید وہ کتاب ہے جو دُنیا میں سب سے زیادہ پڑھی جاتی ہے اور جو اس پر عمل کرتا ہے وہ فلاح پا جاتا ہے۔ قرآنِ مجید کا ہمارے پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر 23 سال تک نزول جاری رہا۔ اس میں انسانی زندگی کے ہر معاملے کے بارے میں ہدایت موجود ہے۔

آج ہم آپ کو کتابیں جمع کرنے کے بارے میں بتائیں گے، مگر اس سے قبل ہم آپ کو کتاب کے ابتدائی سفر کی تاریخ کے بارے میں آگاہ کریں گے۔ کتاب کی سادہ سی تعریف ہے "ایسا تحریری یا مطبوعہ (چھپا ہوا/شائع کیا ہوا) مواد جو متعدد صفحات پر مشتمل ہو اور جسے تہہ کر کے ایک طرف سے سی دیا گیا ہو۔"

جب کاغذ کا وجود نہ تھا تو اُس وقت تحریر کے لیے پتھر کی سِلوں، مٹی اور لکڑی کی تختیوں اور بھیڑ کی کھالوں کا استعمال عام تھا۔ 104ء میں شائیلن (Tsalian) نے ریشمی کپڑا، سوتی اشیاء اور درختوں کی چھال وغیرہ کو پانی میں کئی روز بھگو کر پلپ (لئی) تیار کی جسے پھیلا کر خشک کر لیا گیا۔ اس طرح کاغذ ایجاد ہوا۔ شائیلن کا تعلق چین سے تھا۔ اس طرح کتاب کا سفر کاغذ تک منتقل ہوا۔ چین سے یہ فن بغداد پہنچا۔

1670ء میں اٹلی میں کاغذ سازی کا پہلا کارخانہ قائم ہوا۔ جس سے اس صنعت نے ترقی کی اور کاغذ کا استعمال عام ہوا۔ وگرنہ کاغذ تیار کرنا آسان کام نہ تھا۔ یوں کتاب کا سفر تیزی سے ترقی کے مراحل سے گزرا۔ اب ہم بڑی بڑی لائبریریوں کا تذکرہ سنتے اور ان کتب خانوں میں لاکھوں کتابوں کو دیکھتے ہیں۔

اب آتے ہیں کتابوں کے شوق کی طرف، یقیناً ان دنوں آپ کے اسکول کی چھٹیاں ہوں گی، اس لیے بہتر ہے کہ آپ ان چھٹیوں کو کار آمد بنائیں اور اس شوق کو اپنائیں۔

یاد رکھیے! کتابیں خریدنا، ان کا مطالعہ کرنا اور پھر اسے اپنے گھر کے کسی کونے یا اپنے کمرے میں اچھے طریقے سے رکھنا، تاکہ آئندہ حوالے یا مطالعے کے لیے باآسانی دستیاب ہو جائے، ایک بہترین مشغلہ ہے، جو زمانہ طالب علمی سے شروع ہو کر انسان کی آخری سانس تک برقرار رہتا ہے۔ کتابیں ہی ہمیں علم دیتی ہیں اور معاشرے میں ایک اچھا انسان بن کر رہنے کی تلقین کرتی ہیں۔ دیگر مشاغل کی طرح آپ کے پاس اچھی کتابوں کا ایک معیاری ذخیرہ ضرور ہونا چاہیے جس سے آپ کے علاوہ آپ کے بہن بھائی اور دوست بھی فائدہ اُٹھا سکیں کیوں کہ علم پھیلانے سے ہی پھیلتا ہے۔ لازمی نہیں کہ آپ تمام موضوعات پر کتابیں جمع کریں اپنے شوق اور پسندیدہ موضوع سے متعلق کتابیں جمع کر سکتے ہیں، چاہے وہ محدود ہی کیوں نہ ہو۔

مثال کے طور پر کچھ لوگ قرآنِ مجید کے مختلف تراجم اور تفاسیر پڑھنے اور ان پر عمل کرنے کا شوق رکھتے ہیں تو اُن کی کوشش ہوتی ہے کہ اپنی ذاتی لائبریری میں اس ذخیرے کو آہستہ آہستہ بڑھائیں۔ کچھ احادیث کے مجموعوں کی تعداد میں اضافہ کرتے رہتے ہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت ایک وسیع موضوع ہے جس پر اب تک لاتعداد کتب لکھی جا چکی ہیں۔ آپ چاہیں تو اس موضوع کا بھی انتخاب کر سکتے ہیں۔ دُنیا کے عظیم لوگ جنھوں نے اللہ کی مدد و یقین کے سہارے اور اپنی محنت کے بل بوتے پر کامیابی کے جھنڈے گاڑے اور تاریخ میں زندہ ہو گئے، ان لوگوں کی سوانح کا بھی انتخاب اور مطالعہ آپ میں جینے اور کچھ کر گزرنے کی اُمنگ پیدا کرے گا۔ کچھ لوگ تحریکِ پاکستان کے حوالے سے جاننے کے خواہش مند رہتے ہیں تو کچھ قائداعظم اور علامہ اقبال سمیت دیگر پاکستانی شخصیات پر شائع ہونے والی کتابوں کے جمع کرنے کے شوقین ہوتے ہیں۔

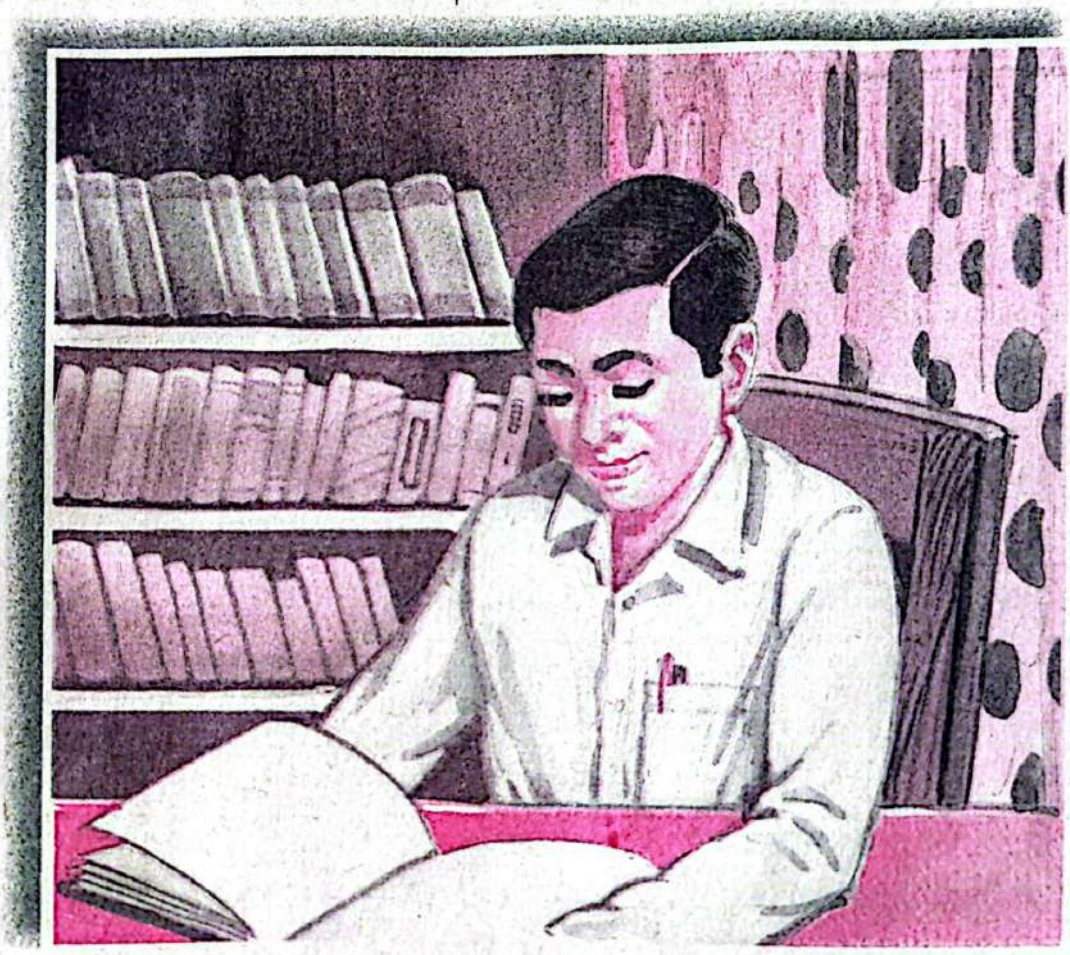

آپ چاہیں تو اپنے ذخیرے میں معلوماتی کتابیں، اُردو اور انگریزی سمیت دیگر مقامی زبانیں جو آپ جانتے ہیں، میں شائع ہونے والے انسائیکلو پیڈیا بھی جمع کر سکتے ہیں یہی انتخاب آپ کے ذوق اور مطالعے کے شغف کو ظاہر کرے گا۔ یاد رکھئے محض کتاب خریدنا ہی اس شوق کی

تکمیل نہیں ہے بلکہ ہر اچھی کتاب مطالعے کے لیے ہوتی ہے اور اچھی باتیں ہمیں عمل کی دعوت دیتی ہیں۔ جو اچھی بات سنو یا پڑھو، اُسے دُوسروں تک ضرور پہنچاؤ تاکہ اچھائی پھیلے اور برائی، ظلم اور جہالت کا اندھیرا کم ہو۔

کتاب کو احسن طریقے سے رکھنا آپ کے حسن سلیقہ کو ظاہر کرے گا۔ اس لیے کتابوں کو حفاظت سے رکھیے۔ ان کے سر ورق (Tittle) کو خراب نہ ہونے دیں اور نہ ہی کتاب کو بدنما بنائیں۔ کاغذ، اخبار یا پلاسٹک چڑھانے سے کتاب محفوظ ہو جاتی ہے۔ مطالعے کے دوران عبارتوں کے نیچے لکیر کھینچنے سے کہیں بہتر ہے کہ آپ علیحدہ کاغذ کی شیٹ پر لکھ لیں یا اس کی علیحدہ نوٹ بک ہی بنالیں۔ آئندہ جب آپ کتاب کا خلاصہ یا خاص خاص جملے یا اقتباسات پڑھنا چاہیں تو یہ نوٹ بک آپ کو مدد دے گی۔

عموماً کتابیں جلد شدہ ہوتی ہیں مگر کچھ کم قیمت کتابیں غیر مجلد ہوتی ہیں۔ بہتر ہو گا کہ انہیں کسی اچھے جلد ساز سے جلد کروالیں تاکہ یہ محفوظ ہو جائے۔ مطالعے کے دوران کتابوں کو الٹ کر رکھنے سے بھی ان کی جلد خراب ہو سکتی ہے۔ اسی طرح مطالعے کے دوران کتاب کے صفحے کو موڑنا بھی مناسب نہیں ہے۔ اس کے لیے بک مارک (Book mark) یا کاغذ کے بنے ہوئے فلیپ استعمال کر سکتے ہیں۔

کتابیں الماری میں سلیقے سے رکھیے تاکہ یہ دیکھنے والوں کو اچھی لگیں اور وہ بھی مطالعے کی طرف راغب ہوں۔ یہ آپ کے لیے بڑی کام یابی ہو گی۔ ان کتابوں کو سال میں ایک دو بار دھوپ میں رکھا جائے۔ انہیں دیمک سے بچانے کے لیے نیم کے پتے اُن کے درمیان رکھ دیں اور وقتاً فوقتاً جراثیم کش ادویات کا چھڑکاؤ بھی کریں۔

نئی کتابوں کے ساتھ ساتھ پرانی کتابیں بھی خریدنا کار آمد ہوتا ہے۔ بلکہ بسا اوقات پرانی کتب کی دُکانوں سے ایسی نایاب کتب بھی مل جاتی ہیں جو عرصہ دراز سے دوبارہ شائع نہیں ہو رہی ہوتیں۔ اپنے دوستوں کو خوشی کے موقع پر اچھی کتابیں دیجئے جس سے اس شوق کو فروغ ملے گا۔

اگر آپ کسی ایسی تقریب میں جا رہے ہوں جہاں کسی مصنف کی آمد بھی یقینی ہو تو آپ ضرور اس مصنف کی کتاب کو ساتھ لے جائیں اور موقع ملے تو صاحبِ کتاب کے اس پر دستخط لے لیجئے۔ یہ آپ کے ذخیرے میں اچھا اضافہ ہو گا۔

کتابوں کا مطالعہ یقیناً آپ کی علمی پیاس بڑھائے گا۔ اس پیاس کو بجھانے کے لیے آپ کے شہر میں عوامی کتب خانے ہوں گے، آپ وہاں جایئے اور علم کے خزانے سے فائدہ اٹھایئے۔ آپ کے اسکول اور کالج میں بھی لائبریری ہو گی۔ آپ وہاں سے بھی علمی فائدہ حاصل کر سکتے ہیں۔

---☆☆---

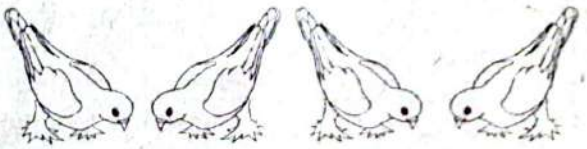

پیدائشی قیدی

ایک کبوتر، کسی شخص کے کبوتر خانے میں رہتا تھا۔ اُس کے مالک نے اُس کے اور اُس کے بچوں کے پر کاٹ رکھے تھے تاکہ وہ اُڑ کر کہیں اور نہ جا سکیں۔ ایک دن ایک کوا، کبوتر خانے میں پڑے پانی کے برتن کے پاس اترا۔ اُسے سخت پیاس لگی تھی۔ وہ پانی پینے لگا تو بڑا کبوتر اُس کے پاس آیا اور اپنے بچوں کی تعداد اور خوب صورتی پر اترانے لگا، کوے نے خاموشی سے کبوتر کی بات سنی۔ کوّے نے پانی پیا اور اڑنے سے پہلے کہنے لگا۔

"تمہارے خواہ جتنے بھی بچے ہو جائیں، تم اس پر خوش نہ ہو کیونکہ تمہارے جتنے زیادہ بچے ہوں گے، کبوتر خانے میں اتنے ہی قیدیوں کا اضافہ ہوتا جائے گا۔"

(سرمد اقبال، اٹک)

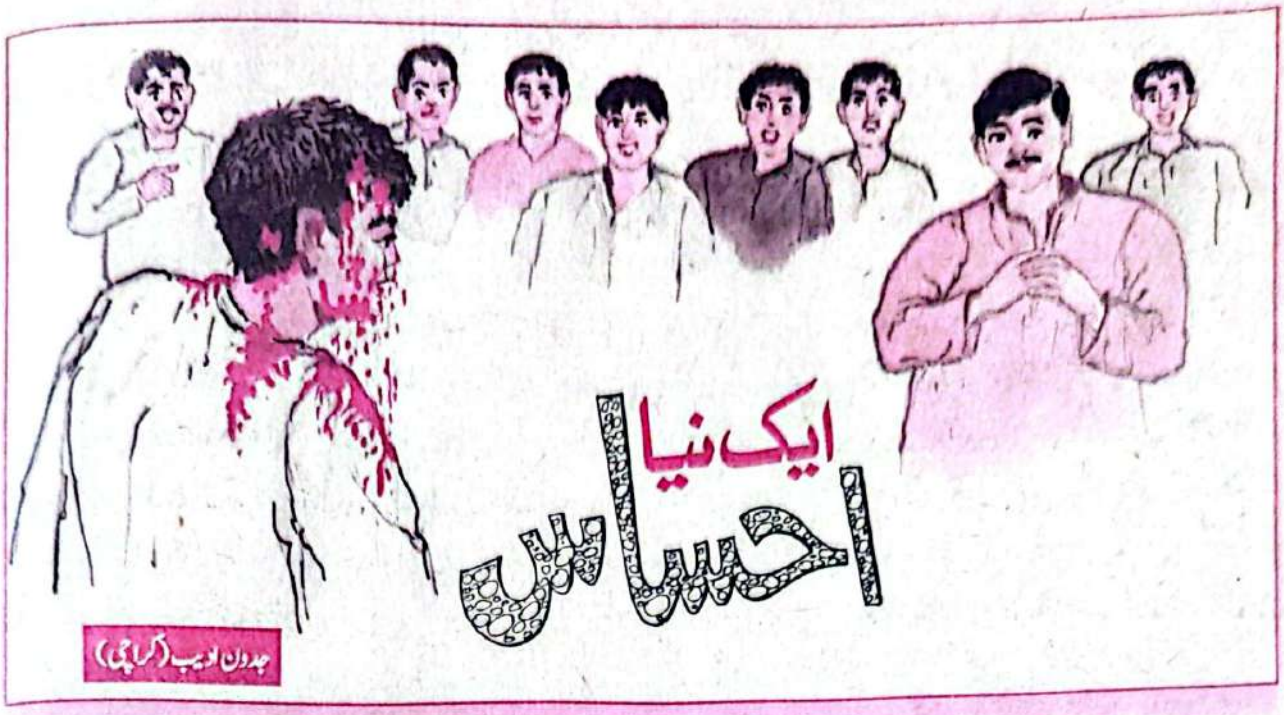

ایک نیا احساس

جدون ادیب (کراچی)

مجھے محلے کے لوگوں نے گلی میں گھیر لیا تھا۔ یہ اطمینان کر لینے کے بعد کہ میرے پاس ہتھیار نہیں ہے، سب مجھ پر بل پڑے تھے۔ کوئی مجھے تھپڑ مار رہا تھا، کوئی مکے مار رہا تھا، کسی نے مجھے بالوں سے پکڑ رکھا تھا تو کوئی مجھے ٹھڈے رسید کر رہا تھا۔ میرا وجود تختۂ مشق بنا ہوا تھا اور میری دبی دبی چیخیں گالیوں کے شور میں گم ہو چکی تھیں۔

گلی میں شور شرابا بڑھتا جا رہا تھا اور لوگ بھی بڑھتے جا رہے تھے۔ ایک ایک کر کے سارے گھروں کی بتیاں جل چکی تھیں۔ لوگ میرا تماشا گھروں کے دروازوں، چھتوں اور کھڑکیوں سے دیکھ رہے تھے۔

اچانک ایک بھاری آواز گونجی۔

"اس کو چھوڑ دو.....؟"

میں نے بازوؤں میں دبا چہرہ اُوپر اٹھایا۔ مجھے مارنے والے پیچھے ہٹ رہے تھے۔ میرے منہ سے خون بہہ رہا تھا۔ میں نے ہونٹوں پر زبان پھیری اور ایک طرف خون تھوک دیا۔

میں نے دیکھا کہ مضبوط جسم والا ایک خطرناک آدمی اپنی شرٹ کے بٹن کھول رہا تھا۔ اُس کے بازوؤں کی مچھلیاں پھڑک رہی تھیں۔

وہ آہستہ آہستہ میری طرف بڑھا۔ اُس کے انداز سے مجھے پتا چل گیا کہ بات وہ نہیں تھی جو میں سمجھا تھا۔ یہ تو سو سنار کی اور ایک لوہار کی والی بات تھی۔ دُوسرے لمحے وہ خطرناک فائٹر مجھ پر حملہ آور ہوا۔ وہ خطرناک انداز میں پینترے بدل بدل کر میرے بدن کے ایک ایک حصے کو نشانہ بنا رہا تھا۔ میں اب تک بہت مار سہہ چکا تھا مگر اس خطرناک آدمی کی مار بہت سخت تھی۔ وہ مجھ پر جوڈو کراٹے اور مارشل آرٹ کے داؤ آزما رہا تھا۔

میں اب پہلے سے زیادہ شور سے چیخ رہا تھا۔ میرے بچاؤ کی ہر کوشش ناکام ہو چکی تھی۔ اب تک نہ پولیس پہنچی تھی اور نہ کوئی ہمدرد آواز بلند ہوئی تھی۔ ہر طرف ایک ہی آواز اُبھر رہی تھی۔

"اِسے مارو..... اس کی ہڈیاں توڑ دو..... اس کا بازو توڑ دو....."

اور ہر آواز کے ساتھ وہ خطرناک آدمی مزید خطرناک ہوتا جا رہا تھا۔ اچانک اُس نے پوری قوت سے میرے ماتھے پر ہتھیلی سے وار کیا۔ مجھے ایک جھٹکا لگا اور میرا منہ اُوپر کو اٹھا۔ اُس نے مجھے گردن سے دبوچ کر دُوسرے ہاتھ سے ایک مکا میری ناک پر مارا۔ میرے حلق سے ایک زور دار چیخ

نکلی۔ میں چکرا کر پیچھے گرنے لگا تھا کہ اُس نے اچھل کر میرے سینے پر ایک لات ماری اور میں دیوار سے ٹکرا کر زمین پر گر گیا۔

میں چاروں شانے چت لیٹا ہوا تھا۔ میرا دماغ سائیں سائیں کر رہا تھا اور بدن کے ایک ایک حصے سے درد اٹھ رہا تھا۔ سر میں جیسے درد کے گولے پھٹ رہے تھے۔ اور منہ پورا خون سے بھر چکا تھا۔

وہ خطرناک فائٹر پینترے بدل رہا تھا۔ اپنے جسم کو گرم رکھنے کے لیے وہ اچھل کود کر رہا تھا۔ اُس نے مجھے گرا تو دیا تھا مگر اب میرے اٹھنے کا انتظار کر رہا تھا۔

میں نے درد کو پیتے ہوئے آنکھوں کو بند کیا۔ آنکھوں میں جمع آنسوؤں کو گرایا اور آسمان کی طرف دیکھا۔

مہربان خدا کا آسمان پُرسکون تھا۔ چمکتے تارے اور روشن چاند دیکھ کر میرے اندر سے ایک سرد آہ نکلی۔ اس سزا پر میرا کلیجہ کٹ کر رہ گیا تھا۔

میں نے سوچا کہ یہ کیسی ناانصافی ہے۔ میں عمر بھر گناہ کے راستے پر چلا اور کبھی ذلت اور خواری کا منہ نہیں دیکھا، آج پہلی بار ایک نیکی کرنے نکلا تھا اور یہ صلہ ملا تھا۔

میری خون آلود آنکھیں آسمان پر جمی تھیں اور میرے اندر ایک آگ بھڑک رہی تھی۔ کیا میں نے غلط فیصلہ کیا تھا؟ کیا نیکی کے راستے پر چلنے والوں کا یہی انجام ہوا کرتا ہے؟ گناہ کے راستے سے جو لوگ لوٹ آتے ہیں، کیا وہ یہی صلہ پاتے تھے؟

اندر کی آگ بھڑکتی جا رہی تھی..... درد اتنا بڑھا کہ درد کا احساس ہی ختم ہو گیا۔ میرے اندر کا ضدی انسان جاگ اٹھا۔ جب یہ خدا کا فیصلہ ہے تو یہی سہی..... مگر شاید کوئی کسر رہ گئی ہے..... اور میری سزا پوری نہیں ہوئی۔

میرے اندر ایک نیا احساس جاگا۔ میں نے اس احساس سے تقویت پائی اور لڑکھڑاتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔

وہ خطرناک فائٹر تاک میں بیٹھا تھا۔ وہ زمین سے بلند ہوا اور فضا میں ہی گھوم کر پوری قوت سے میری گردن پر لات ماری اور میں چیختا ہوا سامنے دیوار سے ٹکرایا اور میرے ذہن پر تاریکی چھا گئی۔ آخری لمحے قریب ہوتے وقت پولیس سائرن کی آواز سنائی دی تھی۔

جب میری آنکھ کھلی تو میں ایک اسپتال میں تھا۔ میرا بدن پٹیوں سے جکڑا ہوا تھا اور بازو میں ڈرپ لگی ہوئی تھی۔ یہ ایک علیحدہ کمرہ تھا اور دروازہ بند تھا۔ کھڑکی سے باہر کا منظر نظر آ رہا تھا، جہاں ایک روشن صبح طلوع ہو رہی تھی.....

اس شام ڈاکٹر نے پولیس کو میرا بیان لینے کی اجازت دے دی۔

میرے بیان میں ساری باتیں پرانی تھیں۔ ایک بات نئی اور انوکھی تھی۔ میں بہتر مستقبل کے لیے شہر آیا تھا۔ میرے کاندھوں پر کئی ذمے داریاں تھیں۔ پھر میں بھٹک گیا اور گلو دادا کے گروہ میں شامل ہو گیا۔ میں ایک بزدل آدمی تھا اس لیے زیادہ تر چوکی داری یا فرار ہونے والی گاڑی کی ڈرائیونگ پر مامور رہتا تھا۔ گلو دادا میرا حصہ ایمان داری سے مجھے ادا کرتا تھا اور میں اس رقم کو عیاشی میں اڑا دیتا تھا۔

پھر ایک دن گلو دادا نے سنار بازار میں ڈکیتی کے دوران ایک بوڑھے کو لوٹ لیا جو پرانے زیورات کو نئے زیورات کی شکل میں تبدیل کرنے آیا تھا۔ بعد میں اخباروں سے پتا چلا کہ اس بوڑھے کی جس بیٹی کی شادی تھی، اُس نے خودکشی کر لی اور بوڑھا بھی اس غم میں مر گیا تھا۔

گلو دادا نے مجھ سے کہا کہ اس سے بہت بڑی غلطی ہو گئی ہے اور وہ بوڑھے کے زیورات واپس کرنا چاہتا ہے۔ گلو دادا نے وہ پوٹلی میرے پاس رکھوائی اور اگلے دن چھاپے کے دوران پولیس کی فائرنگ سے مارا گیا۔ میں گاؤں چلا گیا اور چھے مہینے بعد لوٹا۔ میں اِس دوران گناہوں سے توبہ کر چکا تھا اور اپنے اور گلو دادا کے گناہوں کے کسی حد تک ازالے کے لیے اس بوڑھے کے گھر گیا تھا تاکہ اُس کی امانت واپس کر دوں۔ میں نے اپنا کام احتیاط سے پورا کر دیا تھا۔ مگر پھر چوکی دار پر مامور لڑکوں نے مجھے گرفتار کر لیا.....!

ہیڈ محرر میرا بیان لکھ رہا تھا۔ وہ کافی چونکا تھا اور پھر وہ

چلا گیا۔ دو دن تک میرا علاج ہوتا رہا اور بہت حد تک میری طبیعت سنبھل گئی۔ میں پولیس کی حراست میں تھا اور اسپتال کے باہر اور دروازے پر سپاہی تعینات تھے۔

تیسرے دن مجھے عدالت میں پیش کیا گیا۔ جج نے مجھ سے میرے اقبالی بیان کے متعلق پوچھا تو میں نے تصدیق کر دی۔ تفتیشی افسر نے درخواست کی کہ میرے سابقہ جرائم کی پوچھ گچھ کے لیے ایک ہفتے کا ریمانڈ دیا جائے۔

عدالت نے ریمانڈ دے دیا۔ میں اسپتال میں ہی رہا اور نسبتاً نرم سلوک کا مستحق ٹھہرایا گیا پھر عدالت نے میرا چالان دیکھ کر مجھے جیل بھیجنے کے احکام کے ساتھ ساتھ سرکاری وکیل کی درخواست پر میری ضمانت کی درخواست بھی قبول کر لی۔

میرا اس شہر میں کوئی نہیں تھا۔ ضمانت میرے لیے بیکار تھی اور اب نہ جانے کتنے برس مجھے جیل کی سلاخوں کے پیچھے رہنا تھا۔ میں اس فیصلے پر مطمئن اور خوش تھا۔

اگلے دن مجھے اچانک پتا چلا کہ میری ضمانت قبول ہو گئی ہے اور میں تھوڑی دیر کے بعد رہا کر دیا جاؤں گا.....!

میری ضمانت کس نے دی؟ میں بہت حیران تھا۔ پھر جب میں جیل کے گیٹ سے باہر نکلا تو مجھے چند لڑکے کھڑے نظر آئے۔

یہ وہی لڑکے تھے جنہوں نے مجھے پکڑا تھا اور مارا بھی تھا۔ یہی لوگ میرے ضامن بنے تھے۔ ان کے عقب میں وہی خطرناک فائٹر کھڑا نظر آیا مگر آج اس نے میری طرف بڑھتے ہوئے اپنی شرٹ کے بٹن نہیں کھولے تھے اور آگے بڑھ کر میرے دونوں ہاتھوں کو پکڑ لیا تھا۔

"میرے دوست! ہمیں معاف کر دینا..... ہم تم سے بہت شرمندہ ہیں..... ہم نے تمہارے ساتھ جو سلوک کیا، جو زیادتی کی، اس پر تو خدا بھی ہمیں نہیں معاف کرے گا!"

"نہیں....." میں تڑپ کر بولا: "وہ میرا اور خدا کا معاملہ تھا۔ گناہ کا راستہ پھولوں کی سیج اور نیکی کا راستہ کٹھن ہوتا ہے..... خدا جن کو معافی دینا چاہتا ہے اُن کو گناہوں کی سزا ضرور دیتا ہے..... مجھے کسی سے کوئی گلہ نہیں ہے۔"

تھوڑی دیر بعد میں اپنے نئے دوستوں کے ساتھ اُن کے محلے کی طرف جا رہا تھا۔ جہاں انہوں نے میرے لیے رہائش اور کام کا بندوبست کر رکھا تھا۔

میری گناہوں سے بھری زندگی کا یہ خوب صورت انجام ہو گا..... میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔

• •

باتوں سے خوشبو آئے

☆ بادل بن کر رہو جو پھولوں پر بھی برستا ہے اور کانٹوں پر بھی۔

☆ مصیبت میں مت گھبراؤ کیوں کہ ستارے اندھیرے ہی میں چمکتے ہیں۔

☆ اپنی زندگی کو شمع کی مانند بناؤ جو خود جلتی ہے لیکن دُوسروں کو روشنی دیتی ہے۔

☆ زندگی خدا کی نعمت ہے اُسے دُوسروں کے لیے وقف کر دو۔

☆ ہر شخص سچا دوست ڈھونڈتا ہے مگر خود سچا دوست بننے کے لئے تیار نہیں ہوتا۔

☆ وہ شخص دُنیا میں ہمیشہ کام یاب ہو گا جس کا حوصلہ پہاڑ کی طرح مضبوط ہو گا۔

☆ موت ایک حقیقت ہے اور حقیقت سے ڈر کر نیکی سے ہاتھ نہیں اٹھانا چاہیے۔

☆ تلوار کا وار جسم کو زخمی کر دیتا ہے۔ اور بُری بات روح کو گھائل کر دیتی ہے۔

☆ جو تمہیں عیب سے آگاہ کرے وہی تمہارا حقیقی دوست ہے۔

☆ ہمیشہ سچی بات ہی کہو خواہ سچی بات کڑوی ہی کیوں نہ ہو۔

☆ نہ گرنا کمال نہیں، کمال یہ ہے کہ تم گرو اور پھر از سر نو اٹھ کر کھڑے ہو جاؤ۔

حفصہ کوثر، میاں چنوں

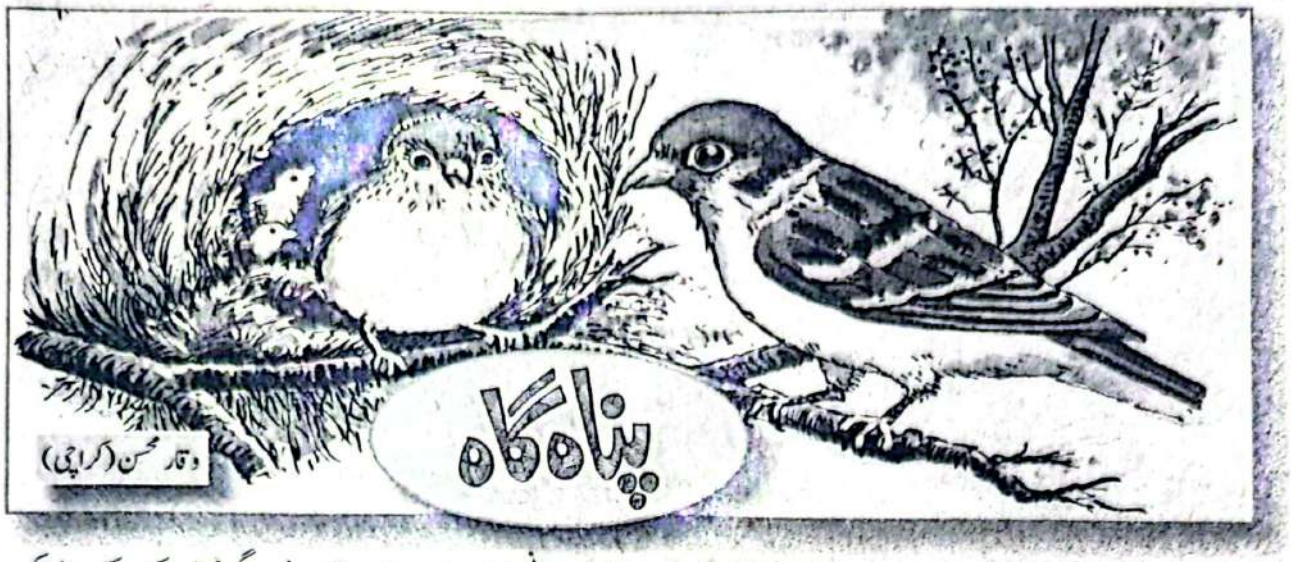

پناہ گاہ

وقار محسن (کراچی)

پہاڑی کے دامن میں ایک زور دار دھماکہ ہوا اور پھر سناٹا چھا گیا۔ چنار کے درختوں کے پتوں کی چلمن سے ستارے حسرت سے زمین کے اس خطے کو گھور رہے تھے جسے جنت ارضی کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ جہاں برف پوش پہاڑوں میں گھری جھیل سیف الملوک کے کنارے رات کے تیسرے پہر پریاں اترتی تھیں۔

"منے کے ابا! کیا سو گئے؟" ایک چنار کے درخت پر اپنے گھونسلے میں لیٹی ایک چڑیا نے چڑے سے پوچھا۔

"اوں..... ہاں..... آں..... نہیں نیک بخت نیند کہاں۔ اب تو مٹی کی چادر اوڑھ کر ہمیشہ کے لئے سونے کو جی چاہتا ہے۔" چڑے نے آہ بھرتے ہوئے کہا۔

"دیکھو! بوڑھے دیوانے اُلّو کے علاوہ سب پنچھی اڑ گئے۔ سارے رشتہ دار، سنگی ساتھی جا چکے۔ ہم کب تک اس موت کی وادی سے چمٹے رہیں گے؟ میرا اور اپنا نہیں تو کم سے کم ان معصوم بچوں کا تو خیال کرو جن کی ابھی لمبی زندگی پڑی ہے۔ آج تو بی فاختہ بھی اڑ گئیں جو امن کی علم بردار تھیں۔ کل ہمارے بڑے بیٹے جو جو نے پھر پیغام بھیجا ہے کہ اُس نے مرگلہ کی پہاڑیوں میں پناہ گاہ ڈھونڈلی ہے۔ ہم سب وہاں زیادہ محفوظ رہیں گے۔" چڑیا بولی۔

"کیوں رانی؟ کیا وہاں حفاظت کرنے والا کوئی دُوسرا خدا ہے۔"

"میں جانتی ہوں کہ اس حسین وادی کے چپے چپے سے ہماری سہانی یادیں وابستہ ہیں۔ ہم نے یہ گھونسلہ ایک ایک تنکا کر کے بنایا تھا۔ اسی گھونسلے میں ہمارے آٹھ بچے پیدا ہوئے، لیکن اب اس قبرستان میں ہم تنہا رہ گئے ہیں۔ ہر وقت چاروں طرف بارود کی بدبو پھیلی رہتی ہے۔"

"تو پھر ٹھیک ہے رانی! تم ایسا کرو کہ ان دونوں بچوں کو لے کر چھانگا مانگا اپنے بھائی کے گھر چلی جاؤ۔" چڑے نے بچوں کی کمر چونچ سے سہلاتے ہوئے کہا۔

"کیا..... کیا کہا تم نے..... میں تمہیں چھوڑ کر چلی جاؤں؟ تم رات بھر جوڑوں کے درد سے کراہتے رہتے ہو۔ ایک دن بھی اگر زیتون کے تیل کی مالش نہ کروں تو رات بھر کروٹیں بدلتے ہو۔ تھوڑا سا اڑتے تو ہو ہانپنے لگتے ہو۔ تم نے یہ کہہ کر میرا دل دکھایا ہے۔ میں تم سے نہیں بولتی۔"

چڑیا نے ناراض ہو کر کروٹ بدلی تھوڑی دیر جھینگروں کی آوازیں سناٹے میں گونجتی رہیں۔ پھر ایک دھماکے کے ساتھ روشنی کا جھماکا ہوا۔ چڑیا کے دونوں بچے سہم کر اپنی ماں سے چمٹ گئے۔

"ارے کیا ہماری رانی روٹھ گئیں؟ لو بھئی ہمیں معاف کر دو۔" چڑے نے اتنا کہا تو چڑیا آنسو پوچھتے ہوئے کہنے لگی۔

"اچھا یہ تو بتاؤ کہ یہ سب کون کر رہا ہے، کیوں کر رہا ہے؟ تم نے اس وادی کا کونا کونا دیکھا ہے۔ ہر شخص کو پیار کرنے والا، مہمان نواز، سادہ، نغمے بکھیرنے والا، پھولوں اور

خوشبوؤں کو پھیلانے والا پایا۔ اسکولوں، گھر کے آنگنوں، باغوں میں قلقاریاں مارتے بچے کتنے پیارے لگتے تھے۔ یہ لوگ تو غیروں کے لئے آنکھیں بچھا دیتے تھے۔ پھر ان چاند ستارہ لوگوں کے درمیان یہ موت کے سوداگر، خونی درندے کہاں سے آگئے؟

"جوجو کی ماں! شیطان اللہ تعالیٰ کو چیلنج کر کے نکلا تھا کہ وہ انسان کو گمراہی کے اندھیرے میں دھکیل دے گا اور فساد پھیلائے گا۔ یہ اسی شیطان کے کارندے ہیں جو اس کے مکروہ پلان کی تکمیل میں لگے ہوئے ہیں۔ خون کی ہولی کھیلنے والے، معصوم بچوں کے درمیان کھلونا بم پھینکنے والے، لہلہاتے کھیتوں کو آگ لگانے والے ہی شیطانی ایجنٹ ہیں۔ یہ کسی ایک شخص، گروپ یا ملک کے دشمن نہیں یہ انسانیت اور امن کے دشمن ہیں۔ لیکن تم دیکھنا ایک دن یہ درندے اپنی ہی آگ میں جل کر بھسم ہو جائیں گے۔"

"لیکن منے کے ابا! یہ لوگ بہت طاقتور ہیں جب ہی تو یہ پھیلتے جا رہے ہیں۔"

"نہیں رانی! پیار، اتحاد اور ایمان سے بڑھ کر کوئی طاقت نہیں۔ اگر سب لوگ متحد ہو کر ان کا مقابلہ کریں تو چند دنوں میں ان کا صفایا ہو جائے۔ میں یہی تو کہتا ہوں کہ ہم کہاں تک اور کب تک بھاگیں گے۔ کہیں تو کھڑا ہو کر ان سے مقابلہ پڑے گا۔ ہماری اور تمہاری تو زندگی کچھ زیادہ نہیں ہے لیکن ہمارے بچوں نے تو ابھی زندگی کا لمبا سفر کاٹنا ہے اور ہاں ایک بات بہت اُمید افزا ہے کہ آج کے بچے نہایت باہمت، ذہین، محنتی اور شفاف سوچ کے مالک ہیں۔ تم دیکھنا زمین کے یہ ستارے اپنی سرزمین کو بارود کی بو سے پاک کر دیں گے۔

"ارے جوجو کے ابا! کیا تم سمجھتے ہو کہ مجھے اپنے اس آشیانے سے پیار نہیں۔ چناروں کے درختوں، ان وادیوں، پہاڑوں اور چشموں سے میرے بچپن اور جوانی کی ان گنت یادیں جڑی ہوئی ہیں۔ اپنے اس گھر کو چھوڑ کر میں کتنے دن جی پاؤں گی۔"

"اچھا اب سو جاؤ۔ بہت رات بیت چکی ہے۔ صبح بات کریں گے۔" چڑے نے کہا۔

اگلے دن چڑیا چڑے نے بھاری دل سے سامان باندھنا شروع کیا تو بے شمار تنکے ان کے ساتھ جانے کے لئے ان کے پروں سے چپک گئے۔ سامان ہی کیا تھا چند مکئی اور مٹر کے دانے، کچھ اخروٹ اور بادام کی گریاں۔ اچانک بہت دُور فضا میں تیرتے بادلوں کے ساتھ آتی ہوئی پرندوں کی قطار کو دیکھ کر چڑا چونکا۔

"رانی! ایسا لگتا ہے کہ یہ پنچھی اسی طرف آ رہے ہیں۔"

"ارے اب اِدھر کون آئے گا، بے گھر پرندوں کا غول کہیں جا رہا ہو گا۔" چڑیا نے افسردگی سے کہا۔

جب پرندوں کا غول قریب آگیا تو جوجو نے خوشی سے چیخ کر کہا۔

"اماں! یہ تو طوطے چچا اور کوئے چچا کی فیملی لگ رہی ہے۔"

"ارے ہاں۔ دیکھو منے کے ابا! ان میں ہمارے بچے بھی ہیں۔" چڑیا ان کا خیر مقدم کرنے کے لئے باہر آگئی۔

پرندوں کا یہ غول جب چنار کی ڈالیوں پر بیٹھ گیا تو جنگل کے درخت خوشی سے جھومنے لگے۔ چنار کے نیچے جنگل کے دُوسرے جانور..... ریچھ، لومڑی، ہرن، خرگوش اور بارہ سنگھا بھی جمع ہو گئے تھے۔ کوئل کی سریلی کوک سے جنگل گونج رہا تھا۔ جوجو کہہ رہا تھا۔

"ابا! اب ہم کہیں نہیں جائیں گے۔ جب کڑی آزمائش کا مقابلہ کرنا ہی ہے تو کیمپوں میں بھوک، گرمی اور خوف سے مرنے سے بہتر ہے کہ ہم اپنے آشیانوں میں مل جل کر اس کڑے وقت کا مقابلہ کریں۔ اور ابا! در در کی خاک چھاننے کے بعد یہ معلوم ہوا کہ اپنے گھر سے زیادہ محفوظ پناہ گاہ کوئی نہیں۔ اسی لئے تو صدیوں سے انسان اور جانور شام ڈھلے گھر کو واپس جانے کے لئے بے چین ہوتے ہیں۔"

پہاڑوں کے پیچھے پھر کہیں دھماکا ہوا لیکن اب اس میں پہلی سی خوف ناک لرزانے والی کڑک نہ تھی۔

---☆☆---

مسکراتا چہرہ

(مریم یونس، اسلام آباد)

اسکول سے گھر پہنچنے کے بعد عامر ہاتھ منہ دھونے کے لئے غسل خانے میں گیا لیکن فوراً ہی واپس آ کر اپنا بستہ کھول کر ایک ایک چیز باہر نکالنے لگا۔ اُس کی امی یہ سب دیکھ رہی تھیں، انہوں نے پوچھا۔

"عامر بیٹا! کیا بات ہے؟ آپ کچھ پریشان دکھائی دے رہے ہیں۔"

"امی، میری گھڑی نہیں مل رہی۔" عامر نے اپنے بستے سے رنگوں کا ڈبا نکالتے ہوئے جواب دیا۔

"بیٹا! اپنے کمرے میں دیکھ لیجئے شاید وہاں ہو۔"

"امی! مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میں نے آج سائنس کے پیریڈ میں اپنی گھڑی میں وقت دیکھا تھا۔" عامر نے اپنی کلائی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"عامر بیٹا! مل جائے گی گھڑی، پہلے کھانا کھا لیجئے۔" امی نے کہا۔

عامر کھانا کھاتے ہوئے بھی مسلسل گھڑی کے بارے میں سوچتا رہا۔

رات ہو گئی، لیکن عامر گھڑی کے لئے پریشان رہا۔

"بیٹا! آپ پریشان نہ ہوں گھڑی مل جائے گی۔" امی نے کہا۔

"یہ گھڑی مجھے نانا جان نے پچھلی سال گرہ پر دی تھی۔ نانا جان کو جب پتہ چلے گا تو وہ کیا سوچیں گے؟" عامر نے جواب دیا۔

"خیر، آپ سو جایئے، کل اسکول بھی جانا ہے۔" امی یہ کہہ کر کمرے سے چلی گئیں اور عامر گھڑی کے بارے میں سوچتے سوچتے سو گیا۔

اگلے دن جب وہ اسکول گیا تو اُس نے اپنی جماعت میں، کمپیوٹر لیبارٹری میں، لائبریری میں، آرٹ روم میں، غرض ہر جگہ گھڑی تلاش کی لیکن گھڑی نہ ملی۔ اُس کے دوستوں نے بھی گھڑی کے بارے میں لاعلمی کا اظہار کیا۔ آخر وہ تھک ہار کر کھیل کے میدان میں ایک بینچ پر جا کر بیٹھ گیا۔ اچانک اُس کا دوست عمیر بھاگتا ہوا اُس کے پاس آیا اور بولا۔

"عامر، عامر، تمہاری گھڑی مل گئی ہے۔" عمیر نے کہا۔ "عمیر! کہاں ہے میری گھڑی؟"

"خان لالہ کے پاس ہے۔" عمیر نے جلدی جلدی کہا اور عامر کو لے کر گیٹ کی طرف چلا گیا۔

"خان لالہ! یہ ہے عامر، کل اِس کی گھڑی گم ہوئی تھی۔" عمیر نے بے تابی سے خان لالہ سے کہا۔

"آیئے عامر بیٹا آیئے، کیسی ہے آپ کی گھڑی؟ اُس کا رنگ کیسا ہے؟" خان لالہ نے سوال کیا تو عامر نے گھڑی کا رنگ بتا دیا اور خان لالہ نے گھڑی نکال کر عامر کے سپرد کر دی۔

"خان لالہ، یہ گھڑی آپ کو کہاں سے ملی؟" عامر نے اپنی گھڑی دیکھتے ہی سوال کیا۔

"بیٹا! یہ مجھے کھیل کے میدان سے ملی تھی۔"

"اوہ، یاد آیا کل جھولا جھولتے ہوئے میں نے گھڑی اُتار کر بینچ پر رکھی تھی، بہت شکریہ خان لالہ۔" عامر نے خان لالہ سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔

"عامر! تمہیں پتہ ہے آج خان لالہ کا اسکول میں آخری دن ہے۔" عمیر نے عامر سے کہا۔

"جی بیٹا! آج میں ریٹائر ہو رہا ہوں۔" اس سے پہلے

عامر کچھ کہتا خان لالہ نے دُکھ بھرے لہجے میں کہا۔

"لیکن خان لالہ آپ تو بہت اچھے ہیں۔" عامر نے معصومیت سے کہا۔ خان لالہ عامر کی بات سن کر مسکرا دیئے اور بولے: "بیٹا! عمر کا اچھائی یا برائی سے کیا تعلق؟" ابھی دونوں دوست خان لالہ کی بات سمجھنے کی کوشش کر رہے تھے کہ اسمبلی کے لئے گھنٹی بجی اور وہ دونوں اسمبلی میں چلے گئے۔

جماعت میں بھی سب بچوں کو پتہ چل چکا تھا کہ خان لالہ ریٹائر ہو رہے ہیں۔ بچوں کی گفت گو کا موضوع خان لالہ تھے۔ عمیر نے بتایا کہ ایک دن جب اُسے گھر سے لینے کوئی نہیں آیا تھا تو خان لالہ اُس کے پاس اُس وقت تک بیٹھے تھے جب تک اُس کے گھر سے کوئی نہیں آیا۔ دانش نے بتایا کہ ایک دن بہت تیز بارش تھی اور اُس کی گاڑی بہت دُور کھڑی تھی۔ خان لالہ چھتری لے کر اُسے گاڑی تک چھوڑنے گئے تھے۔ سب ہی بچوں کو خان لالہ کی کوئی نہ کوئی بات یاد آرہی تھی۔ دانیال نے کہا، "خان لالہ کتنے اچھے ہیں، وہ ہر کسی سے پیار سے بات کرتے ہیں۔"

"میں نے ہمیشہ ان کے چہرے پر مسکراہٹ ہی دیکھی ہے۔" عامر نے اپنا خیال ظاہر کیا۔ بچے جوں جوں خان لالہ کی باتیں کرتے جاتے، اداس ہوتے جاتے تھے۔

دُوسرے دن اسمبلی میں پرنسپل نے خان لالہ کے بارے میں بچوں کو بتایا اور ان کی خدمات کی تعریف کی پھر اسکول انتظامیہ اور اسٹاف کی طرف سے تحفے دیئے۔ خان لالہ نے تحفے لئے اور شکریہ کہہ کر جانے لگے تو کسی نے کہا۔ "رکیئے، خان لالہ۔" انہوں نے مڑ کر دیکھا تو عامر اپنے ساتھیوں کے ساتھ تحفہ لے کر اُن کی طرف بڑھ رہا تھا۔ تحفے کے اُوپر لکھا تھا۔

"پیارے خان لالہ کے لئے۔"

خان لالہ کے چہرے پر ہمیشہ کی طرح آج بھی مسکراہٹ تھی۔

(پہلا انعام: 200روپے کی کتب)

احساس

(زرینہ ملک، کراچی)

آج صبح سے موسم کافی گرم تھا۔ اس لیے میں چاہنے کے باوجود گھر سے باہر نہیں نکل پایا تھا۔ دوپہر کو کھانے کے بعد سب گھر والے آرام کرنے لگے، مگر مجھے نیند نہیں آرہی تھی۔ میں سخت بوریت محسوس کر رہا تھا۔

"کیا مصیبت ہے پہلے پڑھائی اور امتحانات کی پریشانی اور اب یہ بوریت کے دن، اِس سے تو اچھا تھا امتحان ہی ہوتے رہتے۔" میں بڑبڑایا۔

پھر میں امی سے نظر بچا کر کمرے سے نکلا۔ ابھی میں صحن تک ہی پہنچا تھا کہ مجھے چوں چوں کی آواز سنائی دی۔ میں نے باورچی خانہ کی دیوار کے پاس دیکھا وہاں ایک چڑیا کا بچہ زمین پر گرا ہوا نظر آیا۔ مجھے پہلی نظر میں ہی وہ بہت پیارا لگا۔ میرے ذہین میں فوراً اپنی چھٹیوں کو مزے دار بنانے کا پروگرام آیا۔ میں اس چڑیا کے پاس گیا۔ وہ بے چارہ پیاس سے نڈھال ہو رہا تھا۔ میں نے اُس

کے پاس جاکر پیار سے اُسے اٹھایا۔ میں اُسے برآمدے میں لے کر آیا اور پانی پلایا۔ پانی پی کر وہ تازہ دم اور اُڑنے کے قابل ہو گیا۔ وہ اب واپس جانا چاہتا تھا مگر میں اُسے چھوڑنے پر آمادہ نہ تھا۔ مجھے تو تفریح کا ذریعہ مل گیا تھا۔ چڑیا صحن میں آکر چکر کاٹنے لگی۔ مجھے چڑیا کی اس حرکت سے سخت اُلجھن ہونے لگی۔ میں چڑیا کے بچے کو لے کر اندر کمرے میں آگیا اور اس کو پیار سے سہلانے لگی۔ باہر چڑیا کے اڑنے کی رفتار کافی تیز ہو گئی۔ وہ بار بار کھڑکی کی طرف آتی اور پلٹ جاتی۔ اندر چڑیا کا بچہ بھی کافی بے چین تھا۔ اچانک مجھے یاد آیا کہ پچھلے سال جب ہم خالہ کے گھر ملتان گئے تھے میں وہاں سیر کے دوران اپنے گھر والوں سے دُور نکل گیا تھا۔ راستے سے انجان ہونے کی وجہ سے میں بے حد پریشان ہو گیا اور دُوسری جانب میری امی بھی بہت پریشان تھیں اور جب میں گھر واپس پہنچا تو امی کی جان میں جان آئی تھی۔ یہ سوچتے ہی میرے ذہن

میں آیا کہ اس چڑیا کے بچے کی ماں بھی تو اپنے بچے کے لیے بے چین ہو رہی ہے۔ یہ سوچ کر میں چڑیا کے بچے کو لے کر صحن میں آیا اور اُسے آزاد کر دیا۔ چڑیا کا بچہ فوراً اڑ کر اپنی ماں کے پاس چلا گیا۔ اور میں پُر سکون ہو کر اندر کمرے میں آ گیا۔

(دُوسرا انعام: 175 روپے کی کتب)

خیال رکھنا

(محمد زکریا، وہاڑی)

دروازے پر دستک کی آواز سن کر منصور ہمدانی جھنجھلا اُٹھے۔ ابھی کچھ ہی دیر پہلے وہ اپنے اہل خانہ کے ساتھ کھانا کھانے کے لیے بیٹھے تھے۔ ابھی انہوں نے پہلا لقمہ کھانا چاہا تھا کہ دروازے پر دستک نے اُن کے ہاتھوں کو روک دیا۔ اُن کی بیگم نے معنی خیز نظروں سے اُن کی طرف دیکھا کہ اس وقت کون آسکتا ہے؟ منصور ہمدانی نے ہاتھ جھاڑے اور دروازے کی طرف رُخ کیا۔ دروازہ کھولا تو دروازے پر ایک اجنبی کو کھڑے پایا۔ جو ہاتھ میں ٹرے پکڑے کھڑے تھا۔

"السلام علیکم رحمتہ اللہ وبرکاتہ۔" آصف محمود چہرے پر مسکراہٹ لیے بولے۔

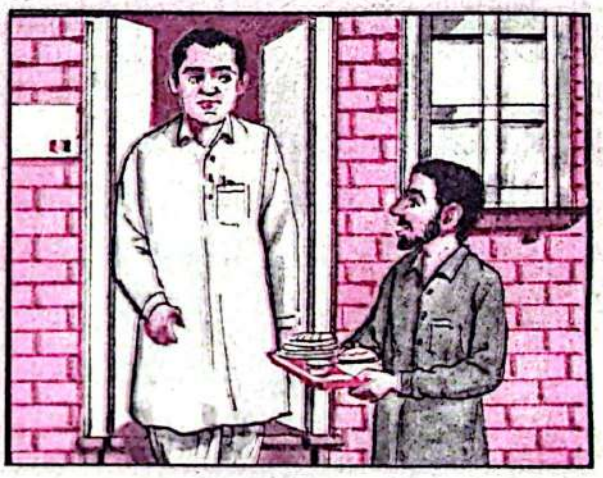

"وعلیکم السلام" منصور ہمدانی نے سلام کا جواب دیا۔

یہ لیجئے.....! آصف محمود ایک ٹرے منصور ہمدانی کی طرف بڑھاتے ہوئے بولے۔

"یہ کیا ہے؟" منصور ہمدانی نے حیرت سے ٹرے کی طرف دیکھا۔

"یہ کھیر ہے۔ میری طرف سے آپ کے لئے آپ کے برابر والا مکان میں نے خریدا ہے۔"

"آپ ٹھہریئے! میں ابھی برتن خالی کروا کر لاتا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ اندر آئے "کون تھا؟" بیگم نے پوچھا۔ "ہمارے نئے پڑوسی آصف محمود کھیر لے کر آئے ہیں۔"

"عجیب بات ہے! ابھی محلے میں آئے ہوئے انہیں چار دن بھی نہیں ہوئے اور لوگوں کو چیزیں بھی دینا شروع کر دیں، مجھے تو لگتا ہے کوئی لالچی آدمی ہے۔" کچھ دیر بعد منصور ہمدانی برتن خالی کروا کر دروازے پر آئے اور شکریہ کے ساتھ انہیں برتن واپس کر دیئے۔ کچھ دنوں بعد پھر آصف محمود کھانے کی ٹرے لئے ہمدانی صاحب کے دروازے پر کھڑے تھے۔ اس کے بعد تو معمول ہی بن گیا۔ آصف محمود ہر تیسرے، چوتھے دن کھانے کی ٹرے لے کر اُن کے دروازے پر آکھڑے ہوتے، ان کی آمد پر ہمدانی کو بڑی حیرت ہوتی کہ وہ ایسا کیوں کرتے ہیں؟ بیگم کا تبصرہ الگ ہوتا۔ ایک دن ہمدانی سے رہا نہ گیا..... آصف محمود ٹرے دے کر واپس جانے لگے تو منصور ہمدانی نے انہیں روک لیا۔

"جناب! میں آپ سے ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں اور وہ یہ کہ آپ یہ سب کچھ کیوں کرتے ہیں؟"

"اوہ..... اچھا! تو یہ بات ہے، ہمدانی صاحب میں تو یہ صرف اور صرف اس لئے کرتا ہوں کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث سنی ہے کہ آپؐ نے فرمایا "جب تُو سالن پکائے تو اُس کے پانی کو زیادہ کیا کر اور اپنے پڑوسیوں کا خیال رکھ۔" (مسلم شریف)

بس جب سے میں نے یہ حدیث سنی ہے میں جب بھی گھر میں کوئی اچھی چیز پکاتا ہوں لے کر آپ کے پاس حاضر ہو جاتا ہوں۔"

حدیث سن کر منصور ہمدانی کا سر جھک گیا۔ انہوں نے تو کبھی اس بارے میں سوچا بھی نہ تھا۔ ان کا ذہن تو کسی اور سوچ میں گم تھا۔ دُوسرے دن منصور ہمدانی کھانے کی ٹرے ہاتھ میں پکڑے آصف محمود کے دروازے پر دستک دے رہے تھے۔

آخر انہوں نے بھی تو اس حدیث پر عمل کرنا تھا۔

(تیسرا انعام: 125 روپے کی کتب)

آمین

راشد علی (کراچی)

دونوں کی نظریں اِدھر اُدھر گھوم رہی تھیں۔ وہ موقع کی تلاش میں تھے کہ کب جیب کی صفائی کی جائے۔

دونوں جیب کترے لوگوں کی جیبوں پر ہاتھ صاف کر کے اپنی خواہشات کا پیٹ بھرتے۔ عید بھی قریب تھی۔ دونوں نے نیا لباس خریدنا تھا۔ جہاں سے بس نے چلنا تھا وہ اسی اسٹاپ سے بیٹھے تھے کہ آہستہ آہستہ بس مسافروں سے بھرنے لگی۔ تقریباً بیس منٹ میں بس مسافروں سے کھچا کھچ بھر چکی تھی۔ پھر وہ چالاکی سے کھڑے ہو گئے اور نظریں گھمانے لگے کہ کس کی اور کس طرح جیب صاف کی جائے۔

ایک نوجوان بس میں سوار ہوا۔

"چل بھئی جوان کرایہ لاؤ۔" کنڈیکٹر نے سوار ہونے والے جوان سے کہا۔

"سانس بھی لینے دے گا یا نہیں۔" اُس نے بے زاری سے کہا۔

اور پھر اُس نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور بٹوے سے پیسے نکالنے لگا۔ اُس کے بٹوے میں ہزار ہزار روپے کے نوٹ دیکھ کر دونوں کی آنکھوں میں چمک آگئی۔ چند منٹوں بعد جیرے کا ہاتھ بٹوے کے قریب پہنچ چکا تھا کہ کنڈیکٹر کی آواز آئی۔ "جوان آگے ہو آگے۔"

"کیا مسافروں کے سر پر چڑھ جاؤں۔" نوجوان نے تنک کر کہا اور کنڈیکٹر کو کوستا ہوا آگے بڑھ گیا۔ جیرے کے ہاتھ سے فوراً شکار نکل گیا، کیوں کہ نوجوان بڑبڑاتا ہوا آگے بڑھ گیا اور سیٹ پر بیٹھے مسافر کے ساتھ اس طرح کھڑا ہو گیا کہ اس کی جیب سیٹ پر بیٹھے مسافر کی نگاہ کے سامنے تھی۔ یہاں جیرے کے لیے بٹوے پر ہاتھ صاف کرنا ممکن نہ تھا۔

جیرے کو اس کنڈیکٹر پر غصہ آنے لگا جس نے اُس کا شکار ضائع کیا تھا۔

اب وہ کسی دُوسرے شکار کی تلاش میں تھے۔ بالکل دروازے کے ساتھ ایک ادھیڑ عمر شخص کھڑا تھا۔ اُس کی جیب انہیں کچھ مال کے حساب سے وزنی معلوم ہوئی۔ بڑی ہوشیاری سے انہوں نے اس کی جیب کو چھوا تو انہیں کچھ کاغذ محسوس ہوئے۔

"لگتا ہے اس میں کچھ ہے۔" نصیرے نے جیرے سے آہستگی سے کہا۔

پھر دونوں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں کچھ اشارے کیے۔ جیرا بالکل اُس کی جیب کے سامنے اِس طرح کھڑا ہو گیا کہ نصیرا ہاتھ ڈال کر اسے صاف کر سکتا تھا۔

"چرر..... چرر..... چرر..... چرر....." چرر کی آواز کے ساتھ ڈرائیور نے اچانک بریک لگائی۔

"بدھو! کہیں کا، گاڑی چلانی نہیں آتی ہے، اناڑی کہیں کا۔" اس ادھیڑ عمر شخص نے چیخ کر کہا، جس کی جیب کی صفائی ہونے والی تھی۔ اچانک بریک لگنے سے وہ دروازے کے ساتھ والی سیٹ پر جا لگا۔ ڈرائیور نے یہ بریک ایک سواری کو سوار کرانے کے لیے لگائی تھی۔ بس میں سوار ہونے والا بوڑھا تھا۔

"بابا کو جگہ دو، چچا آگے ہو آگے۔" کنڈیکٹر نے کہا۔

بس بھری ہے، مگر تمہارا پیٹ نہیں بھرے گا۔" ادھیڑ عمر شخص نے پھر غصے سے کہا۔

اُس کا پیٹ، سیٹ سے جا لگا تھا مگر پھر بابا کے احترام میں

وہ آگے بڑھا۔ اُس نے اپنا رخ دُوسری طرف موڑ لیا۔ ایسا کرنے سے وہ جیرے کے ہاتھ سے نکل گیا۔

جیرے نے نصیرے کو ناکامی پر افسوس کا اشارہ کیا۔

وہ ادھیڑ عمر شخص سیٹ پر بیٹھے ہوئے شخص کے ساتھ کنڈیکٹر کے خلاف بولنے لگا۔

"ان کو ذرا ترس نہیں آتا۔ ان کے بس میں ہو تو گھر میں بیٹھے ہوئے لوگوں کو بلا لائیں۔" سیٹ پر بیٹھے شخص نے کہا۔

"ڈرائیور اناڑی اور لالچی ہے۔" ادھیڑ عمر آدمی نے کہا۔

"ارے دوست! ڈرائیور کو مت کوس یہ تو تیرا اور اس نوجوان کا محسن ہے۔ اگر یہ بریک نہ لگاتا اور بابا سوار نہ ہوتا تو تیری جیب کو بریک لگ گئی تھی۔" جیرے کے من نے اُس سے کہا۔

اب ان کی نظر ایک تیسرے شخص کی طرف اٹھی، جس کے ایک ہاتھ میں ایک چھوٹا سا لفافہ تھا۔ اس نے دُوسرے ہاتھ سے چھت کے ساتھ لگے ہوئے لوہے کے ڈنڈے کو پکڑا ہوا تھا۔ دونوں اب اُس کی طرف لپکے۔

اچانک بس کا ٹائر پھٹنے کی آواز آئی۔

"بس کا ٹائر بھی آج ہی پھٹنا تھا۔ چل بھئی کرایہ لا۔ آفس کے لیے دیر ہو رہی ہے۔" لفافے والا آدمی بڑبڑاتا ہوا بس سے اُتر گیا۔

ٹائر پھٹنے سے اُس کی جیب بھی بچ گئی تھی۔

"یار آج کیا مسئلہ ہے؟" ایسا تو پہلے کبھی نہیں ہوا۔

جیرے نے نصیرے کی بات پر ہاں میں گردن ہلائی۔

کرایہ واپس لے کر وہ کسی دُوسری بھری بس میں سوار ہو گئے اور تگ ودو کے بعد ایک ایسا ہٹوا ہاتھ لگا جس میں پورے تین ہزار روپے تھے۔

"اب کپڑا مارکیٹ چلتے ہیں دونوں بوسکی کا جوڑا لیتے ہیں۔" جیرے نے کہا۔

"کپڑے فیشن ہاؤس سے ہی سلوائیں گے وہ بہت اچھے کپڑے سلائی کرتے ہیں۔" نصیرے نے کہا۔

وہ لیاقت مارکیٹ میں داخل ہوئے تو ہر طرف لوگوں کی بھیڑ تھی۔ دونوں نے ساڑھے چھے میٹر کے دو عدد جوڑے پسند کر کے کٹوا بھی لیے۔ پیسے دینے کے لیے جیرے نے جیسے ہی جیب میں ہاتھ ڈالا۔

"اوہ..... یہ کیا.....!"

"جیب کٹ گئی کیا؟" کپڑے والے نے پوچھا۔

"ہاں دوست! لوگ کتنے ظالم ہیں ذرا بھی خوفِ خدا نہیں ہے۔ تین ہزار روپے کوئی لے اُڑا ہے۔" جیرا بولا۔

"اللہ ایسے لوگوں کو ہدایت دے۔" کپڑے والے نے اتنا کہا تو دونوں بے ساختہ "آمین" کہہ اٹھے۔

کپڑے والے نے بوسکی کے جوڑے کے اپنی طرف کھسکا لیے اور دُوسرے گاہکوں کی طرف متوجہ ہو گیا۔

دونوں خالی ہاتھ اور منہ لٹکائے وہاں سے اٹھے۔ آج سیر کو سوا سیر مل گیا تھا۔

"ہم بھی تو ایسا ہی کرتے ہیں۔ جن کے ساتھ ہم کرتے ہیں انہیں کتنی تکلیف ہوتی ہو گی۔" جیرے نے کہا۔

"ہاں جیرے! جب مصیبت اپنے اُوپر آتی ہے تو تکلیف ہوتی ہے دُوسروں کی تکلیف کا احساس نہیں ہوتا ہے۔"

وہ پہلی بار سنجیدہ باتیں کر رہے تھے۔ دونوں کے دلوں میں ایک انوکھی ہل چل تھی۔ انہیں پہلی بار کسی تکلیف پر ٹھیس پہنچی تھی۔ پھر وہ باتیں کرتے باہر کی طرف بڑھنے لگے۔ مارکیٹ سے گزرتے ہوئے ایک ایسی دُکان کے سامنے سے گزرے جہاں گاہکوں کا بہت رش تھا۔ یہاں سے آسانی سے کوئی چیز اٹھائی جا سکتی تھی۔ دُکان دار نے دُکان پر ایک اسٹیکر چسپاں کیا ہوا تھا۔ جس پر چوروں کے لیے ایک جملہ لکھا تھا۔

"چوری فطرتاً بُری چیز ہے۔ جس کی دلیل یہ ہے کہ اگر چور کی بھی چوری ہو جائے تو اُسے بھی بہت غصہ آتا ہے۔ اس لیے براہِ کرم چوری سے پرہیز کریں۔"

یہ جملہ پڑھ کر انہیں پھر اپنے آپ پر غصہ آنے لگا۔ اب ان کے قدم مارکیٹ سے باہر کی طرف بڑھنے لگے، مگر یہ قدم پہلے قدموں سے بالکل مختلف تھے، کیوں کہ ان کے دل سے نکلی بے ساختہ "آمین" اب قبول ہو چکی تھی۔ ☆☆

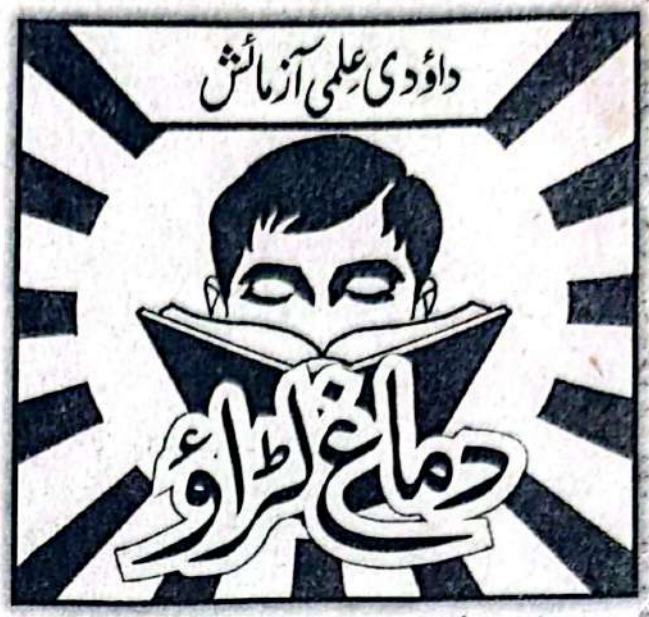

درج ذیل دیے گئے جوابات میں سے درست جواب کا انتخاب کریں۔

1۔ قرآن مجید کی کون سی سورۃ ایک دُعا کی شکل میں ہے؟

i۔ سورۂ الناس ii۔ سورۂ فاتحہ iii۔ سورۂ علق

2۔ دُنیا کا پہلا تحریری دستور کون سا ہے؟

i۔ میثاق مدینہ ii۔ صلح حدیبیہ iii۔ بیعت العقبیٰ

3۔ حضرت ایوب علیہ السلام اپنے کس خاص وصف کی وجہ سے شہرت رکھتے ہیں؟

i۔ حُسن ii۔ دراز قد iii۔ صبر

4۔ اذان میں "اللہ اکبر" کتنی مرتبہ کہا جاتا ہے؟

i۔ تین مرتبہ ii۔ چار مرتبہ iii۔ چھ مرتبہ

5۔ ایک صحت مند انسان کے جسم کا درجہ حرارت کتنے سینٹی گریڈ ہوتا ہے؟

i۔ 98c ii۔ 95c iii۔ 100c

6۔ تابکار شعاعوں کا پتہ کس آلے سے لگایا جاتا ہے؟

i۔ جائیرو سکوپ ii۔ لیکٹو میٹر iii۔ گیگر کاؤنٹر

7۔ لفظ "ریڈیم" کے معنی کیا ہیں؟

i۔ شعاعیں برسانے والا ii۔ پگھلتا ہوا لاوا iii۔ فولادی چٹانیں

8۔ پاکستان کا سب سے بڑا سول اعزاز کون سا ہے؟

i۔ تمغۂ امتیاز ii۔ ستارۂ قائداعظم iii۔ ستارۂ امتیاز

9۔ مور کس ملک کا قومی نشان ہے؟

i۔ سپین ii۔ برطانیہ iii۔ یوگنڈا

10۔ پاکستان کے قیام کا اعلان کس تاریخ کو ہوا تھا؟

i۔ 14 اگست ii۔ 3 جون iii۔ 5 جولائی

جوابات علمی آزمائش مئی 2010ء

1۔ سورۂ یٰس 2۔ حضرت ابو بکر صدیقؓ 3۔ ذبح اللہ 4۔ دُعا 5۔ 100 دن بعد 6۔ وقت 7۔ چراغ حسن حسرت 8۔ خیبر 9۔ نیوزی لینڈ 10۔ نسیم حجازی

اِس ماہ بے شمار ساتھیوں کے درست حل موصول ہوئے۔ ان میں سے 3 ساتھیوں کو بذریعہ قرعہ اندازی انعامات دیے جا رہے ہیں۔

☆ اقبال احمد خان، کراچی (200 روپے کی کتب)

☆ اسامہ بن حسن، شیخوپورہ (175 روپے کی کتب)

☆ ماریہ فاروق پشاور (125 روپے کی کتب)

دماغ لڑاؤ سلسلے میں حصہ لینے والے کچھ بچوں کے نام بہ ذریعہ قرعہ اندازی: ماہ نور فاروق اوکاڑا۔ ماریہ ناز اٹک۔ عثمان علی میاں والی۔ پاکیزہ حسین حیدر آباد۔ وجیہہ زبیر کراچی۔ اسامہ بن عظمت راول پنڈی۔ فائزہ شکیل وزیر آباد۔ ذیشان علی حیدر ڈیرہ اسماعیل خان۔ مریم عادل لاہور۔ محمد عمر حسن جھنگ۔ احتشام الحق لاہور۔ ثانیہ طلعت سیال کوٹ۔ ثوبیہ انجم آزاد کشمیر۔ محمد سعد الاسلام اسلام آباد۔ سامعہ خالد شکر گڑھ۔ مدیحہ جاوید سرگودھا۔ محمد جاوید لاہور۔ محمد ضیاء اللہ میاں والی۔ فرخندہ عالم گوجرانوالہ۔ معروفہ جاوید ڈیرہ اسماعیل خان۔ عمارہ بشیر لاہور۔ مروہ شاہد سیال کوٹ۔ ساجد علی ننکانہ۔ سید اسد عباس گوجرانوالہ۔ عاصم جاوید لاہور۔ عائشہ شہزاد، محمد شاہ زیب گجرات۔ اقصیٰ طاہر لاہور۔ محمد آصف ڈیرہ غازی خان۔ کومل معطر سرگودھا۔ محمد ابراہیم سلیم فیصل آباد۔ عریشہ احسان اللہ لاہور۔ محمد فیاض بہاول پور۔ محمد طلحہ جہلم۔ عاقب سفیان بھکر۔ احمد سلمان ملک وزیر آباد۔ سلمان احمد بہاول نگر۔ رمشاء امین پشاور۔ آمنہ ظفر لاہور۔ انس نسیم خان کراچی۔ سعد بن رفیق رحیم یار خان۔ اعجاز الحق جھنگ۔ عظیم حسن کراچی۔ عمیر بن قمر رحیم یار خان۔ محمد آفتاب عالم کرک۔ محمد آدم اشفاق لاہور۔ سارہ کفیل واہ کینٹ۔ لائبہ شاہد لاہور۔ تحریم معراج لاہور۔ حبیب اللہ بلوچ کراچی۔ محمد زبیر ارشد ملتان۔ کشف قریشی بہاول پور۔ محمد سعید الحسن حافظ آباد۔ فارحہ ظفر رحیم یار خان۔ نمرہ شاہین۔ خوشاب۔ ☆☆

ہر حل کے ساتھ کوپن چسپاں کرنا ضروری ہے۔ آخری تاریخ 10 جون 2010ء

دماغ لڑاؤ

نام: _____

مقام: _____

پتا: _____

_____

دادا کی چھتری

نجمہ یاسمین یوسف (لاہور)

جون کا مہینہ تھا۔ دس پندرہ دن سے سخت گرمی پڑ رہی تھی۔ آسمان پر دُور دُور تک بادل کا نام ونشان نہ تھا، لُو کے گرم تھپیڑوں نے سانس لینا دُشوار کر دیا تھا۔ ایسے سخت موسم میں امیر الدین اپنے ایک ایکڑ کے آموں کے باغ میں چارپائی پر گاؤ تکیے کی ٹیک لگائے نیم دراز تھے۔ سامنے مونڈھوں پر آموں کے دو بیوپاری ان سے لنگڑا دسہری بہارنی اور سندھڑی کا سودا کرنے میں مصروف تھے۔ امیر الدین کا بیٹا شریف الدین باپ کے ساتھ ہی چارپائی پر ایک طرف بیٹھا ان تینوں کی باتوں کو غور سے سن رہا تھا۔ سندھڑی، بہارنی اور دسہری کی فصل تقریباً تیاری ہوچکی تھی اس لیے اب ان کو اتارنے کی تیاری ہو رہی تھی البتہ باقی قسم کے آم چونکہ ذرا دیر سے پکتے ہیں اس لیے ابھی ان کا نمبر نہیں آیا تھا۔ بیوپاری امیر الدین کی جسمانی معذوری کا فائدہ اٹھانا چاہتے تھے اور کم سے کم قیمت پر زیادہ سے زیادہ درختوں کا سودا کرنے کی کوششوں میں تھے جب کہ بازار میں ان آموں کی قیمت زیادہ تھی چنانچہ کافی دیر سے بحث چل رہی تھی۔ شریف الدین گو ابھی کمسن تھا مگر حساس بہت تھا۔ اسے یہ بھاؤ تاؤ کی اونچ نیچ ایک آنکھ نہ بھاتی تھی۔ مگر بڑوں کے ادب کی وجہ سے وہ ان کی بات چیت میں مداخلت نہیں کر سکتا تھا مگر وہ جی ہی جی میں بیٹھا کڑھے جا رہا تھا کہ نہ جانے ابا جی کو ایسا کیا فائدہ ہے کہ وہ اس باغ کے لیے اتنی محنت کرتے ہیں اگر اس کو بیچ دیں تو لاکھوں روپے ہاتھ آجائیں اور یہ روز روز کی بک بک جھک جھک بھی ختم ہو جائے۔ مگر یہ بات انہیں سمجھائے کون؟ دونوں بہنوں کی شادیاں ہو چکیں، اماں بیمار اور بوڑھی ہیں اور ابا جی کی مرضی کے خلاف بول ہی نہیں سکتیں۔ لے دے کر رہ گیا میں بچارہ تو ابھی میری پڑھائی بھی پوری نہیں ہوئی، روزگار کی بات تو بہت دُور کی ہے، بھلا ایسے میں میری بات کی کیا شنوائی ہو گی؟ اُس نے دل ہی دل میں فیصلہ کیا کہ آج کے بعد وہ اپنے باپ کو اتنی گرمی اور لُو کے رحم وکرم پہ نہیں رہنے دے گا اور بیوپاریوں کے جانے کے بعد ابا جی کو باغ بیچنے پر قائل کرنے کوشش ضرور کرے گا۔ ابھی وہ دل ہی دل میں اپنے باپ سے بات کرنے کے لیے اچھے الفاظ سوچ رہا تھا کہ دونوں بیوپاری امیر الدین کو نوٹوں کی گڈیاں پکڑا کے سلام دُعا کے بعد رخصت ہو گئے۔ اب سندھڑی اور بہارنی کے درخت ان کی ملکیت تھے۔ وہ آموں کو اتارنے کے لیے آدمیوں کا بندوبست کرنے کے لیے چلے گئے۔

امیر الدین نے شریف سے کہا۔

"بیٹے! یہ پیسے میں نے رومال میں باندھ دیے ہیں تم بھاگ کر اپنی اماں کو دے آؤ پھر آ کے مجھے لٹا دینا اب میں بہت تھک گیا ہوں اور ہاں ننھے کو بھی ساتھ لے آنا تم اکیلے

مجھے سنبھال نہیں سکو گے۔"

"ابا جی! اب میں بڑا ہو گیا ہوں آپ کو اچھی طرح سنبھال لوں گا مگر آپ کا حکم ہے تو میں ننھے بابا کو ساتھ لے آؤں گا۔"

یہ کہہ کر شریف نے باغ کے آخری کونے میں بنے چھوٹے سے پختہ گھر کی طرف تیزی سے دوڑ لگا دی اور ماں کو پیسے پکڑا کر ننھے بابا کو ساتھ لے کر منٹوں میں باپ کے پاس آگیا۔ ننھے نے شریف کی کمر کے پیچھے سے آہستگی کے ساتھ گاؤ تکیہ سرکایا اور شریف نے باپ کے دونوں شانوں کو پکڑ کر آرام سے ان کو سیدھا لٹا دیا۔ ننھے نے امیر الدین کی ٹانگیں سیدھی کیں اور شریف بہت محبت سے باپ کی ٹانگیں دبانے لگا۔ امیر الدین نے بیٹے کا بازو پکڑ کر پیار سے سینے سے لگا لیا اور اُس کے بالوں میں محبت سے انگلیاں پھیرنا شروع کر دیں۔ اور پھر بیٹے کا سر دونوں ہاتھوں میں لے کر اُس کی پیشانی کو چومنا شروع کر دیا۔ بس یہ محبت بھرا لمحہ شریف کو دل کی بات زبان پر لانے کی جرأت وہمت دلا گیا۔ اس نے باپ کے سینے پر پیار سے اپنا سر رکھ دیا اور کہنے لگا۔

"ابا جی! ایک بات بتائیں گے؟" امیر الدین نے شفقت سے کہا ایک نہیں جتنی چاہو باتیں پوچھو شریف نے ادب سے باپ کا ماتھا چوما اور بولا۔

"ابا جی! آپ اس باغ کے لیے اتنی تکلیف کیوں اٹھاتے ہیں، لوگوں کی بک بک مجھے ذرا اچھی نہیں لگتی۔ میری مانیں باغ کو بیچ دیں اور جو پیسے ملیں انہیں بینک میں جمع کرا کے منافع حاصل کریں۔"

یہ سنتے ہی امیر الدین کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ انہوں نے اُوپر کے دھڑ کو تھوڑی سی حرکت دینے کی کوشش مگر ناکام رہے انہوں نے بیٹے کا ہاتھ پکڑ کر اُسے اپنے اور زیادہ قریب کر لیا۔ پھر کچھ دیر اُن کی آنکھیں دُور خلاؤں میں کچھ تلاش کرتی رہیں اور جب یہ آنکھیں ماضی کے سفر سے واپس آئیں تو آنسوؤں سے بھری ہوئی تھیں۔ پھر وہ کہنے لگے۔

"شریف بیٹا! جب پاکستان بنا تو میں پانچ سال کا تھا میرے ابو امی اور دادا جان جن کو میں اپنی توتلی زبان میں دا جان کہتا تھا ہم سب پاکستان بننے کے بعد لاہور کے ایک محلے میں رہنے لگے۔ یہ ایک بڑی بلڈنگ تھی، جو مختلف لوگوں کے نام الاٹ تھی۔ ایک سرکاری سکول میں میرے ابو بطور ہیڈ ماسٹر تعینات تھے۔ میں چونکہ ان کی اکلوتی اولاد تھا اس لیے لاڈ پیار کے علاوہ میری تربیت، پڑھائی اور نظم وضبط کی عادت کے لیے تینوں یعنی داجان، امی اور ابو مجھ پر پوری توجہ دیتے تھے۔ اور اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ اُس نے مجھے اپنے بزرگوں کے سامنے ہمیشہ سرخرو رکھا، دا جان کی محبتوں کا مرکز میری ذات

تھی۔ میں ہر وقت کوئی نہ کوئی فرمائش لیے ان کے پاس پہنچ جاتا۔ وہ میری چھوٹی چھوٹی شرارتوں پر کئی کئی دن ہنسا کرتے تھے۔ ایک دن میں نے کہا۔

"داجان آپ کے پاس 90 پیسے ہیں۔"

کہنے لگے "ہیں مگر تم کیوں پوچھ رہے ہو؟" میں نے کہا "دس پیسے میرے پاس ہیں اگر آپ نوے پیسے مجھے دے دیں تو میرا روپیہ پورا ہو جائے گا۔"

یہ سن کر وہ بہت دیر تک ہنستے رہے۔ انہوں نے ابو امی کو بطورِ لطیفہ یہ بات سنائی اور مجھے پورے دو روپے دیے اور جب میں بینک میں منیجر ہو گیا تھا تب وہ مجھے یہ بات سنا کر چھیڑا کرتے تھے۔" یہ کہہ کر امیر الدین نے ایک ٹھنڈا سانس بھرا۔ شریف نے رومال سے ان کی آنکھیں صاف کیں اور پھر ہمہ تن گوش ہو گیا۔

"پھر ابو آگے کیا ہوا؟" شریف نے بے چینی سے پوچھا۔

امیر الدین نے بات آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

"شہر سے دُور ایک مربع زمین کلیم میں الاٹ ہو گئی تھی مگر اس زمین کو آباد کرنے کے لیے اُن کے پاس پیسے نہیں تھے، اس لیے انہوں نے ایک ایکڑ زمین اپنے پاس رکھ کر باقی بیچ دی اور ان پیسوں سے ٹیوب ویل لگوالیا اور مختلف قسم کے آموں کے ننھے ننھے پودے اپنے ہاتھوں سے لگا کر اس باغ کی بنا ڈالی تھی۔ جس دن چھٹی ہوتی ہم سب مل کے یہاں آتے، داجان ان پودوں کی نگہداشت اپنے بچوں کی طرح کرتے تھے۔ گرمی، سردی، برسات غرض ہر موسم کی سختی خندہ پیشانی سے برداشت کر کے ان پودوں کو پروان چڑھایا۔ اسی دوران میں نے بی اے پاس کر کے بینک میں ملازمت کر لی۔ دادا جان اگرچہ بوڑھے ہو گئے تھے مگر باغ کی دیکھ بھال بابا کے ساتھ مل کر شوق سے کرتے تھے۔ پھر انہوں نے میری شادی کی اور اللہ تعالیٰ نے انہیں تمہاری دو بہنوں اور تمہارا پردادا بنا دیا۔ اسی زمانے میں ہمارے رہائشی حصے پر جھگڑا کھڑا ہو گیا اس کا مالک ہم سے اسے خالی کرنا چاہتا تھا تاکہ وہ اسے دگنے چگنے پیسوں پر اٹھا سکے۔ اس وقت ہم اُتنے پیسے دے نہیں سکتے تھے اور یہ علاقہ کافی حد تک آباد ہو چکا تھا۔ چنانچہ روز روز کے تقاضوں سے تنگ آ کر ہم نے یہاں بھی یہ چھوٹا سا گھر بنا لیا پھر ہم سب یہاں آگئے مگر یہاں آنے کے کچھ دن بعد دا جان کا انتقال ہو گیا اور اس کے ٹھیک ایک ماہ بعد میرے بینک میں ڈاکہ پڑا میں نے ایک ڈاکو کو قابو کر لیا مگر دُوسرے ڈاکو نے فائر کر کے میری کمر کی ہڈی توڑ دی اور مجھے تمام عمر کے لیے اپاہج کر دیا۔ نوکری ختم ہوئی۔ علاج اور آپریشنوں کے پے در پے اخراجات نے جو کچھ بینک سے ملا تھا سب ختم کر دیا۔ میرے بچے اُس وقت سے اب تک یہ باغ ہی تو ہے جو ہمیں عزت کی روٹی دے رہا تھا۔ مجھے آج بھی ایسا لگتا ہے جیسے یہ باغ نہیں ہے بلکہ دادا جان کی دی ہوئی چھتری ہے جس کے سائے تلے انہوں نے مجھے اور میرے خاندان کو بھوک اور ذلت کی دھوپ سے بچا رکھا ہے۔" یہ کہتے ہوئے امیر الدین کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

انمول موتی

دس باتیں، دس باتوں کو ختم کر دیتی ہیں۔

توبہ	گناہ کو
دُکھ	زندگی کو
غصہ	عقل کو
صدقہ	مصیبت کو
چغلی	دوستی کو
نماز	بے حیائی کو
نیکی	بدی کو
جھوٹ	رزق کو
ظلم	انصاف کو
تکبر	اعمال کو

(مشیت حسین، گلگت)

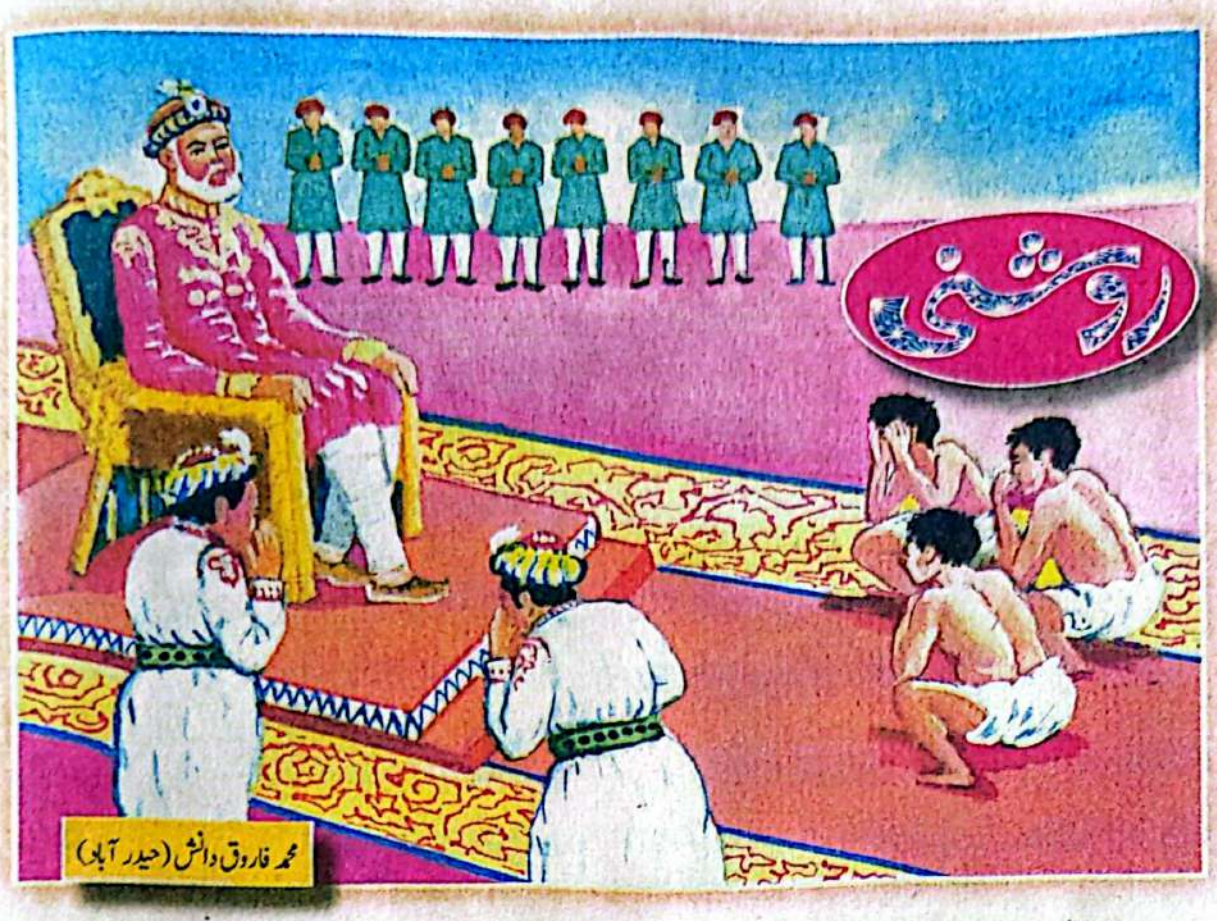

"وزیر اعظم!" بادشاہ سلامت کی آواز محل میں گونجی۔ سارا دربار تھرا اُٹھا۔ وہ اُس وقت بے حد غصے میں تھے۔ اُن کے سامنے تین ملزمان موجود تھے اور وہ اُن کا فیصلہ سنانے والے تھے۔ جس رعب سے انہوں نے آواز نکالی تھی، وہ کسی طور بھی ان ملزمان کے حق میں نہیں جاتی تھی۔

"جی بادشاہ سلامت! حکم فرمایئے۔" وزیر اعظم نے انتہائی عاجزی اور انکساری سے کہا۔

"داروغہ سے کہو کہ ان تینوں کو دو دن کے لیے قید کر دے اور تیسری صبح....." بادشاہ سلامت نے سزا سناتے ہوئے چند لمحوں کے لیے توقف کیا۔

"اور تیسری صبح....." وزیر اعظم نے حیرانی سے سوال کیا۔

"تیسری صبح لکڑیوں کا الاؤ روشن کر کے ان تینوں کو اس میں ڈال دیا جائے۔" بادشاہ نے شاہی حکم صادر کیا۔

"نہیں بادشاہ سلامت! ہم مر جائیں گے۔" اُن میں سے ایک چیخا۔

"یہ سراسر ظلم ہے!" دُوسرا چیخا۔

"رحم کیجئے عالی مرتبت!" تیسرے نے بادشاہ کے آگے ہاتھ جوڑ کر عاجزی کرتے ہوئے کہا۔

"آہا ہا ہا! اب تم رحم کی اپیل کر رہے ہو۔ تم نے ہمارے قہر کو للکارا ہے۔" بادشاہ نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ "اب تمہیں سزا سے کوئی نہیں بچا سکتا۔"

"ہم بے موت مارے جائیں گے۔" دُوسرے شخص نے عاجزی سے کہا۔

"ہمارا تو کوئی قصور نہیں ہے۔" تیسرا بولا۔

"زبان چلاتے ہو بادشاہ سلامت کے آگے۔" ایک سپاہی نے آگے بڑھ کر اُس کی گدی پر ہاتھ جما دیا۔

"ہمیں چھوڑ دیجئے! ہم نے....."

سپاہی نے اس کا گریبان پکڑ کر اُسے کھینچ لیا۔ مجبوراً اسے بھی چپ ہی رہنا پڑا۔

"حدِ ادب ملحوظ خاطر رکھا جائے!" بادشاہ کی پھنکارتی ہوئی آواز سے دربار میں سناٹا چھا گیا۔

"تم لوگوں کو شاید علم نہیں کہ بادشاہ کا فیصلہ اٹل ہوتا ہے۔" وزیر اعظم نے معاملے کو ختم کرتے ہوئے کہا۔ "جو سزا ایک بار وہ سنا دیتے ہیں وہ تبدیل نہیں ہوتی۔"

"مگر ہم....."

"اگر مگر کرنے کی چنداں ضرورت نہیں!" وزیر اعظم پُر جوش لہجے میں بولا۔ "تمہارا جرم سنگین ہے اور اس کی سزا تمہیں مل کر ہی رہے گی۔"

اس کے بعد وہ لوگ کچھ اور کہنا چاہتے تھے لیکن داروغہ نے انہیں اس کی اجازت نہیں دی۔ پھر چھ سپاہیوں نے اشارہ پاتے ہی آگے بڑھ کر اُن تینوں کو تھاما اور گھسیٹتے ہوئے محل سے باہر لے گئے۔ اُن کا رُخ قید خانے کی طرف تھا۔

"کوئی اور فریادی ہو تو پیش کرو۔" بادشاہ نے دریافت کیا۔

"نہیں! آج کی کارروائی یہیں تمام ہوتی ہے۔"

داروغہ نے کورنش بجا لاتے ہوئے بادشاہ کی خدمت میں عرض کی۔

"میں آپ کا بے حد ممنون ہوں کہ آپ نے میری فریاد پر کان دھرا۔" دربار میں موجود ایک شخص نے کہا۔

"اور ان شیطان صفت افراد کو موت کی سزا سنائی۔"

"فریادی، اس میں شکریہ کی کوئی بات نہیں۔" بادشاہ کا غصیلہ مزاج تبدیل ہو چکا تھا اور اب وہ ایسا بادشاہ نظر آرہا تھا جو اپنی رعایا کو انصاف اور امن مہیا کرنے کے لیے تیار رہتا ہے۔

"شکریہ ادا کرنا تو میرا فرض ہے سرکار!" وہ پھر عاجزی بھرے لہجہ اختیار کرتے ہوئے بولا۔

"تم نے اپنا فرض بہتر طریقے سے ادا کیا ہے فریادی!" بادشاہ نے تشکرانہ لہجے میں کہا۔ "تم نے ہماری مملکت میں ہونے والے ایک ایسے کام کی طرف توجہ دلائی جو اگر وقوع پذیر ہو جاتا تو ظلم ہو جاتا۔" بادشاہ نے اُس کی تعریف کی۔

"آپ کی تعریف کے لیے بندہ بے حد ممنون ہے۔" وہ بے حد جھکتے ہوئے کہنے لگا۔ اُسے بادشاہ کے دربار میں اتنی پذیرائی ملے گی، اس کے بارے میں اُس نے سوچا تک نہ تھا۔

"اِسے انعام واکرام سے نوازا جائے۔"

بادشاہ سلامت کا یہ جملہ سنتے ہی ہیرے جواہرات سے بھری تھیلی ایک مصاحب نے بادشاہ کے ہاتھ میں رکھی۔ اُس نے مسکراتے ہوئے وہ تھیلی اُس فریادی کے ہاتھ پر رکھ دی۔ وہ اُسے پا کر بے حد خوش ہوا اور بادشاہ کو دُعائیں دیتا ہوا چلا گیا۔

---☆☆---

"ارے ملکہ عالیہ! یہ آپ کیا کرنے لگی ہیں؟" بادشاہ سلامت جب زنان خانے میں پہنچے تو انہوں نے دیکھا کہ ملکہ عالیہ نے اپنی انگلیاں جلتی ہوئی شمع کی لو پر رکھی تھیں۔

"مجھے یہ کام کرنے دیجئے حضور!"

"ایسا نہ کیجئے!" بادشاہ نے ملکہ عالیہ کی طرف پیش قدمی کرتے ہوئے کہا۔ "اس طرح تو آپ کی انگلیاں جل جائیں گی۔" انہوں نے ملکہ کا ہاتھ جھٹک کر ایک طرف کر دیا لیکن چند ہی ساعتوں کے بعد ملکہ نے دوبارہ اپنی انگلیاں شمع کی لو پر رکھ دیں۔

"آخر آپ ایسا کیوں کر رہی ہیں؟" بادشاہ نے نہایت اُداسی سے کہا۔ "آپ نہیں جانتیں کہ ایسا کرنے سے آپ کے ہاتھوں کی انگلیاں جل کر سیاہ ہو جائیں گی۔" وہ آب دیدہ ہو گئے۔

"آپ کو میرے ہاتھوں کے جلنے کی اس قدر پروا ہے۔" ملکہ نے نہایت سنجیدگی سے کہا۔

"مجھے اس کی پروا نہیں ہو گی تو اور کسے ہو گی۔"

بادشاہ سلامت نے ملکہ کے ہاتھ کو شمع پر سے ہٹاتے ہوئے ریشمی رومال میں انگلیوں کو لپیٹ دیا۔

"اگر آپ کے ہاتھ کو کچھ ہو جاتا تو....." وہ نہایت سنجیدہ تھے۔

"میری انگلیوں کی اس قدر پرواہ..... اور آپ کو ان تین قیمتی جانوں کی پروا نہیں جنہیں آپ نے زندہ جلا دینے کی سزا سنائی ہے۔"

"اُن کا جرم اتنا سنگین ہے کہ انہیں ایسی عبرت ناک سزا کا دیا جانا ضروری ہے۔"

"میری نظر میں تو وہ کوئی جرم نہیں کر رہے بلکہ وہ تو ایک نیک کام کر رہے ہیں۔"

"یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں ملکہ عالیہ!" بادشاہ سلامت ایک دم حیران رہ گئے۔ "آپ اِن کے اس عملِ بد کو نیکی سے تعبیر کر رہی ہیں۔"

وہ جانتے تھے کہ ملکہ ہمیشہ ان کی انصاف پروری سے خوش رہتی ہیں۔ وہ جب بھی سزا سنا کر آتے تھے ملکہ اُن سے کہتی تھیں کہ انہوں نے حق کا بول بالا کیا ہے لیکن آج یہ کیا ہو گیا کہ ایک فریادی کی فریاد پر انہوں نے تین ملزمان پر فردِ جرم عائد کرتے ہوئے سزا سنائی تو ملکہ نے اپنے ہاتھوں کو جلانے کی کوشش کر ڈالی اور بادشاہ کو یہ باور کرایا کہ وہ غلط سزا دے رہے ہیں۔

"وہ معاشرے میں روشنی پھیلانا چاہتے ہیں بادشاہ سلامت۔" ملکہ نے تمہید باندھتے ہوئے کہا۔

"ہمیں ایسی کسی روشنی کی ضرورت نہیں۔" بادشاہ اچانک غصے میں آگئے۔ "نہیں ہے ضرورت ہمیں ایسی روشنی کی، ہمارے پاس روشنی کی کوئی کمی نہیں۔"

"روشنی کا بڑھنا نیک شگون ہوتا ہے، یہ کوئی بدشگونی نہیں۔" ملکہ نے اپنی بات بڑھائی۔

"آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں ملکہ! ہمارے ملک کا ہر چھوٹا بڑا، جوان و بوڑھا، مرد و عورت روشنی کی مانند ہے۔" بادشاہ نے جذباتیت سے کہا۔ "پھر آپ کس طرح کہہ سکتی ہیں کہ ہمارے پاس روشنی کی کمی ہے۔"

"آپ کی یہ روشنی صرف مردوں تک ہی محدود ہے نا!" ملکہ نے طنزیہ کہا۔ "عورتوں کے پاس تو نہیں؟"

"کیا ضرورت ہے عورتوں کو اس روشنی کی۔ وہ مردوں کی روشنی کے سہارے اپنی زندگی گزارنے کی عادی ہیں۔"

بادشاہ سلامت غصے سے چلائے۔

"ہماری زندگی کے تمام معاملات مرد انجام دیتے ہیں اس لیے عورتوں کو....."

"بس آپ کی بھی وہی سوچ ہے جو تمام حکم رانوں کی ہوتی ہے۔" ملکہ عالیہ نے بے حد سنجیدگی سے کہا۔ "دُنیا کہاں سے کہاں پہنچ چکی ہے اور آپ کا انداز بالکل بھی نہیں بدلا۔"

"آپ چاہتی ہیں کہ میں انہیں اس جرم کا ارتکاب کرنے دوں۔"

"آپ اُسے جرم نہ کہیں۔ ان کا مشن وقت کی اہم ضرورت ہے۔ ان کی ہر طریقے سے مدد کی جانی چاہیے نہ کہ انہیں زندہ جلا دیا جائے۔"

"یہ..... یہ..... آپ کیا کہہ رہی ہیں۔" بادشاہ نے اپنے غصے پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ "اگر انہوں نے اپنا مشن شروع کر دیا تو ہمیں خادمائیں، باندیاں اور کنیزیں کہاں سے ملیں گی، کون خدمت کرے گا آپ کی؟" وہ حیرانی سے بولے۔

"آپ اس کی فکر نہ کیجئے، اس روشنی سے فیض یاب ہو جانے والی ہر لڑکی گھریلو کام کاج چھوڑ کر بیٹھ جائے گی، میرا خیال ہے ایسا نہیں ہو گا۔" ملکہ کی بات میں کافی وزن تھا۔

"آپ چاہتی ہیں ہم اپنا فیصلہ واپس لے لیں۔"

"ہاں! بالکل!" ملکہ نے اٹل لہجے میں کہا۔

"ٹھیک ہے ہمیں آج رات کی مہلت دی جائے۔"

بادشاہ سلامت نے ملکہ عالیہ سے مہلت طلب کی اور ساری رات اپنے فیصلے اور ملکہ کی باتوں پر غور کرنے میں صرف کر دی۔ ان کی آنکھوں کے سامنے ملکہ کا شمع کی لو پر ہاتھ رکھنے کا منظر بار بار گھوم رہا تھا۔

اگلی صبح دربار لگایا گیا۔ تینوں ملزموں کو دوبارہ دربار میں بلایا گیا۔ وہ تینوں ڈرے ہوئے تھے۔ کل رات اُنہوں نے جاگ کر گزاری تھی۔ بادشاہ سلامت کے ساتھ اس وقت دربار میں

مسکراہٹ

انسان کا چہرہ اس کے خیالات کا آئینہ دار ہوتا ہے ہر شخص آپ کا چہرہ دیکھ کر آپ کی طبعیت کا اندازہ کر سکتا ہے۔ آپ اگر کسی سے ملتے وقت خلوص اور محبت کا اظہار کریں گے تو جواب میں وہ شخص بھی آپ سے پُر جوش انداز میں ملاقات کرے گا۔ آپ کی مسکراہٹ ہر شخص کے دل میں گھر کر لے گی اور وہ بھی آپ کی مسکراہٹ سے متاثر ہو کر مسکرا دے گا۔ لیکن اگر آپ کا چہرہ بسورتا ہوا یا غصہ کی وجہ سے پیشانی پر تیوری چڑھی ہوئی ہو تو کوئی بھی آپ کے پاس نہیں آئے گا یا آپ سے مل کر خوش نہیں ہو گا۔

اگر آپ اپنے دل سے کینہ اور بغض کو نکال دیں تو آپ ہر دل میں جگہ پائیں گے نکتہ چینی اور عیب جوئی کی عادت کو بھی چھوڑ دیں، اگر کسی میں کوئی عیب نظر آئے تو چشم پوشی کریں اور دُوسروں کی خوبیوں کی دل کھول کر داد دیں۔ پھر آپ دیکھیں گے کہ وہ کس طرح آپ سے محبت کا اظہار کرتے ہیں، اس طرح دوستی بڑھے گی اور معاشرے میں محبت اور اخوت میں اضافہ ہو گا۔

کسی دانش ور کا قول ہے کہ جب آپ گھر سے نکلیں تو آپ کے لبوں پر مسکراہٹ ہونی چاہیے۔ اپنے دوستوں کا استقبال مسکراہٹ سے کیجئے۔ خود بھی خوش رہیے اور دُوسروں کو بھی خوش ہونے کا موقع دیجئے کیونکہ مسکراہٹ کے لیے کوئی قیمت ادا نہیں کرنی پڑتی لیکن اس کے فائدے بہت سے ہیں۔

(آصف کریم، حیدر آباد)

ملکہ عالیہ بھی موجود تھیں۔

"سنو!" بادشاہ نے تینوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "اگر تم اپنے منصوبے سے ہاتھ اٹھالو تو ہم تمہاری سزا معاف کر سکتے ہیں۔"

"بادشاہ سلامت!" ایک کی بھاری آواز دربار میں گونجی۔ "آپ ہمیں جو سزا چاہیں، دے دیں لیکن ہم اپنے منصوبے سے دست بردار نہیں ہوں گے۔" وہ اپنے ارادے کا پکا تھا۔

"لوگوں کے اندر جذبہ بیدار ہو چکا ہے۔ آپ کتنے لوگوں کو جلانے کے لیے الاؤ روشن کرائیں گے۔"

دُوسرے نے نہایت دلیری سے کہا۔

"ہم نہیں تو ہمارے بعد آنے والے دُوسرے لوگ اس منصوبے پر ضرور عمل کریں گے۔"

تیسرے نے بھی نہایت جوش اور جذبے کے ساتھ کہا۔

"بہت خوب!" بادشاہ سلامت نے تالی بجاتے ہوئے کہا۔ "ہم تمہاری دلیری سے بے حد خوش ہوئے ہیں۔" وہ اپنی مسند سے اُٹھ کر اُن تینوں کی طرف قدم بڑھانے لگے۔

"میں اپنے دربار کے لوگوں کو بتانا چاہتا ہوں کہ کل رات میں نے ان کے معاملے پر خوب غور کیا۔"

"اچھا سرکار!" وزیر اعظم نے کہا۔

"پھر میں نے اندازہ لگایا کہ میرا فیصلہ درست نہیں تھا۔"

"ہائیں!" تمام درباریوں نے اپنے دانتوں میں انگلیاں دبا لیں۔ ایسا بادشاہت کی تاریخ میں پہلی بار ہوا تھا کہ کوئی بادشاہ اپنے فیصلے کو خود غلط کہے، غلط کو درست کہنے کی روایت تو صدیوں سے چلی آرہی تھی۔

"تو پھر جناب.....!" کئی درباری یک زبان ہو کر بول پڑے۔

"ہمارے ان جواں ہمت ساتھیوں نے ہمارے علاقے میں لڑکیوں کی تعلیم کے لیے ایک مدرسہ کھولنا چاہا تھا۔"

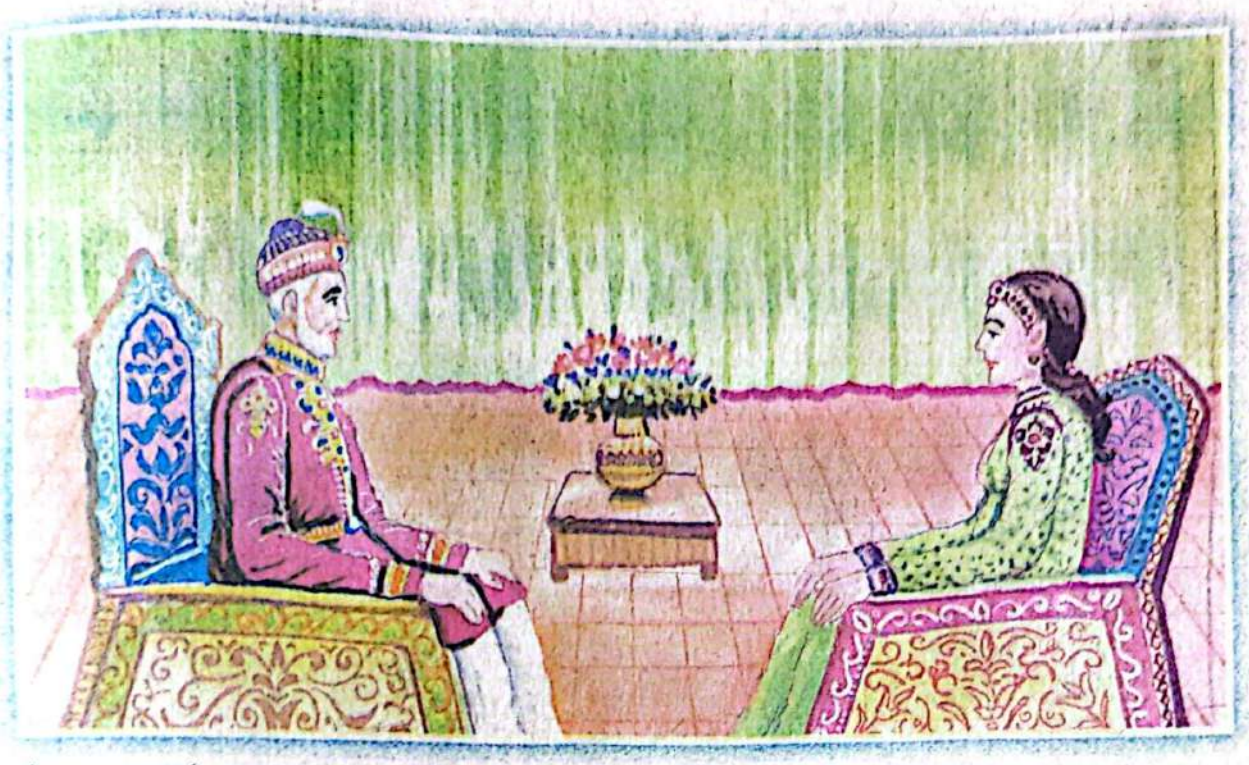

بادشاہ نے کہا۔

"جی جی....."

"اور ہماری سلطنت میں ایسا آج تک نہیں ہوا۔" ایک درباری بولا۔

"پڑھنا تو مردوں کا کام ہے مردوں کا۔" داروغہ سینہ پھیلا کر بولا۔ "بھلا لڑکیوں کا اس کام سے کیا تعلق؟"

"یہ باغی ہیں باغی..... روایت سے انحراف کر رہے ہیں۔" وزیر اعظم نے بھی بحث میں حصہ لیا۔ "لڑکیوں کا کام گھر داری ہے، ان کا پڑھنے لکھنے سے کیا واسطہ!" اُس نے اپنا فیصلہ صادر کیا۔

"لیکن ہم نے ملکہ عالیہ کی باتوں پر غور کرتے ہوئے اس بات کا فیصلہ کیا ہے کہ ہم ان پرانی روایات کو توڑ ڈالیں گے۔"

"جی کیا مطلب؟" وزیر اعظم نے پوچھا۔

"مطلب یہ کہ اب ہمارے ملک کی لڑکیاں بھی پڑھیں گی۔ انہیں بھی علم کی روشنی حاصل کرنے کا اتنا ہی حق ہے جتنا کہ مردوں کو۔"

"آپ کیا کہہ رہے ہیں حضور!" وزیر اعظم نے کہا۔

"میں درست کہہ رہا ہوں۔" وہ خوشی سے بولے۔ "ہم ان کی سزا کو نہ صرف معاف کرتے ہیں بلکہ اب مدرسہ بھی سرکاری سرپرستی میں کھلے گا۔ نہ اُسے کوئی تالا لگائے گا اور نہ کسی کو اُسے آگ لگانے کی اجازت ہو گی۔"

"ہائیں....." درباریوں نے دانتوں تلے انگلیاں دبالیں۔ وہ جانتے تھے کہ بادشاہ سلامت کسی طور پر لڑکیوں کی تعلیم کی حمایت نہیں کریں گے۔ لیکن اب تو معاملہ الٹ چکا تھا۔

"یہ تینوں سرکاری اتالیق مقرر کیے جاتے ہیں۔ ان کی بھرپور مدد کی جائے۔"

بادشاہ سلامت نے عدل کی نئی روایت قائم کرتے ہوئے کہا۔

"مرحبا! بادشاہ سلامت!" وہ تینوں چلائے۔

بادشاہ سلامت نے ملکہ کی طرف دیکھا وہ مسکرا رہی تھیں۔ بادشاہ کی نظر ملکہ کی انگلیوں کی جانب اُٹھ گئی جو رات کو شمع کی لو کو چھونے سے سیاہ پڑ چکی تھیں لیکن ان کی یہ سیاہی علم کی روشنی کو بچانے میں مددگار ثابت ہوئی تھی۔ انہیں اس بات پر فخر تھا کہ اب ان کی مملکت کی لڑکیاں بھی پڑھ لکھ سکیں گی۔

فائر بریگیڈ کی کہانی

نسرین شاہین (کراچی)

پہلے فائر بریگیڈ کا ادارہ یا عملہ نہیں ہوتا تھا اگر کسی کے گھر میں آگ لگ جاتی تو اُس گاؤں یا دیہات کا ہر آدمی فائر مین بن جاتا جس گھر یا محلہ وغیرہ میں آگ لگتی تھی وہاں سے لے کر دریا یا جہاں کنواں ہوتا تھا لوگ ایک قطار کی شکل میں کھڑے ہو جاتے تھے پھر کنویں یا دریا سے پانی کی بھری بالٹی ایک ہاتھ سے دُوسرے ہاتھ میں منتقل ہوتی ہوئی آخر اس جگہ پہنچ جاتی جہاں آگ لگی ہوتی تھی اور یوں یہ پانی اس آگ پر ڈالا جاتا، یہ کام بہت زیادہ دیر طلب تھا جس کی وجہ سے آگ پھیل جاتی اور کافی نقصان ہوتا تھا۔

2 ستمبر 1666ء میں لندن میں نہایت خوفناک آگ لگی جس سے تقریباً 13200 گھر تباہ ہوئے اور اس واقعے میں سینٹ ہال سمیت 87 گرجا گھر بھی تباہ ہو گئے تھے۔ یہ آگ پانچ دن تک بھڑکتی رہی اور لندن شہر کو راکھ کا ڈھیر بناتی رہی۔ تقریباً پورا شہر راکھ تلے دب گیا تھا، کیونکہ شہر میں زیادہ تر تعمیرات لکڑی سے کی گئی تھیں اس لیے بہت زیادہ نقصان ہوا۔ یہ لندن کی تاریخ میں آتش زدگی کا سب سے بڑا واقعہ تھا جسے ''گریٹ فائر آف لندن'' کے نام سے یاد کیا

جاتا ہے۔ اس واقعے کا دل چسپ پہلو یہ ہے کہ اس میں صرف چھ افراد یقینی طور پر ہلاک ہوئے۔ لیکن مورخین کا خیال ہے کہ یہ تعداد کہیں زیادہ رہی ہو گی۔ تاہم اس واقعے کے بعد لندن کے فائر سروس کو جدید تقاضوں کے مطابق بنانے کے کام کا آغاز ہوا۔ انہوں نے آگ بجھانے کے لئے ایک ایسا پمپ ایجاد کیا جو کہ ہاتھ سے چلتا تھا اور جس میں سے پانی ایک نلکی کے ذریعے اسپرے کی شکل میں پھیل کر باہر نکلتا تھا یہ طریقہ پہلے طریقے کی نسبت زیادہ بہتر تھا۔ پھر آگ بجھانے کے لئے رضا کار تنظیمیں ترتیب دی گئیں۔ ایک شخص ہاتھ میں گھنٹی اور دیگر آلات لے کر گشت کرتا تا کہ آگ کی اطلاع دے سکے۔

1835ء میں نیویارک میں پہلی مرتبہ ایک ایسا ادارہ یا کمپنی وجود میں آئی جس کا کام علاقے میں گشت کر کے یہ دیکھنا ہوتا تھا کہ علاقے میں جہاں کہیں آگ لگے اس پر جلد از جلد قابو پایا جائے۔ اس ادارے نے کام شروع کیا تو اس کے ممبران کی تعداد 40 تھی لیکن صرف ایک سال بعد ہی اس تعداد میں کافی اضافہ ہو گیا۔ یہ ایک طرح کی فائر پولیس تھی۔

پہلا فائر ہاؤس نیویارک میں 1855ء میں وجود میں آیا۔ آج کل امریکہ میں ایک ہزار سے زائد فائر ڈپارٹمنٹ کام کر رہے ہیں جو کہ پروفیشنل فائرمین رکھتے ہیں یعنی اس عملہ میں کام کرنے والے افراد کو باقاعدہ آگ بجھانے کی تربیت دی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ سینکڑوں کی تعداد میں ایسے ادارے بنائے گئے جو کہ رضا کارانہ طور پر آگ بجھانے کا کام کرتے ہیں۔

1865ء میں میٹرو پولیٹن فائر بریگیڈ ایکٹ منظور کیا گیا۔ دُوسری جنگ عظیم کے خطرات بڑھنے پر ایک نئے ایکٹ کے ذریعے معاون فائر سروس قائم کی گئی اور پورے لندن میں دونوں سروسز کا جال بچھا دیا گیا۔ دورانِ جنگ فائر بریگیڈ کا عملہ جنگ کی تباہ کاریوں سے بہت موثر انداز میں نمٹا۔

سابق برطانوی وزارئے اعظم مسٹر بلز اور سر ونسٹن چرچل کے ادوار میں لندن فائر بریگیڈ کے وقار میں بہت اضافہ ہوا تھا۔ سر ونسٹن چرچل نے اپنی ایک مشہور تقریر میں آگ بجھانے والوں کو "میلے کچیلے چہرے والے ہیرو (The heros with Griny faces) قرار دیا۔

دُوسری جنگ عظیم کے اوائل میں برطانوی حکومت کو ملک بھر میں یکساں انداز کی فائر فائٹنگ فورس قائم کرنے کی اہمیت کا احساس ہوا۔ لہٰذا 18 اگست 1941ء کو ہنگامی بنیاد پر نیشنل فائر سروس قائم کی گئی۔ 1948ء میں لندن فائر بریگیڈ میں بڑے پیمانے پر تبدیلیاں کی گئیں اور لیمبیتھ کوارٹر میں پہلا سینٹرل کنٹرول روم قائم کیا گیا۔ 1950ء کی دہائی کے اواخر اور 1960ء کی دہائی کے اوائل میں بننے والے قوانین کے باعث آگ سے تحفظ کے اقدامات کو مزید اہمیت حاصل ہوئی۔

جنگ عظیم دوم کے بعد دُنیا بھر میں ہنگامی حالات میں امدادی کارروائیاں کرنے والے اداروں کے کردار، اُن کے مقاصد اور تنظیم میں بنیادی تبدیلیاں کی گئیں۔ جنگ عظیم دوم کے بعد دُنیا بھر میں شہر دفاع کے محکمے قائم ہوئے، تا کہ حالتِ جنگ میں سویلین آبادی کو جنگ کی تباہ کاریوں سے زیادہ سے زیادہ تحفظ فراہم کیا جاسکے۔ جوہری ہتھیاروں کے استعمال کے بعد اس نئے خطرے سے نمٹنے کے لیے بھی تیاریاں کی گئیں اور ان ہتھیاروں سے تحفظ کے لئے پناہ گاہیں تعمیر کی گئیں۔

1970ء کے بعد بہت سے ممالک میں ایسے بہت سے واقعات رونما ہوئے جن میں بڑے پیمانے پر امدادی کارروائیوں کی ضرورت پڑی۔ چنانچہ ان اداروں کی کارکردگی کے بارے میں بہت سے نئے سوالات نے جنم لیا۔

1980ء کے بعد سرد جنگ ختم ہونے سے دُنیا کو لاحق جوہری خطرات میں کمی آئی، لیکن جدید طرزِ زندگی کے تیزی سے فروغ کے باعث بہت سے دیگر خطرات میں اضافہ ہونے لگا۔ اگرچہ پہلے کے مقابلے میں اب دُنیا میں بڑی جنگوں کی تعداد کم ہے، لیکن قدرتی آفات، انسانوں کی غلطیوں کی وجہ سے

ہونے والے حادثات اور دہشت گردی کے خطرات موجود ہیں اور موخر الذکر دو خطرات پہلے کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہو گئے ہیں۔ امدادی کارروائیاں کرنے والے اداروں کے کردار کے حوالے سے گیارہ ستمبر 2001ء کے بعد بہت سے نئے سوالات نے سر اٹھایا اور ماہرین نے اس ضمن میں بہت کچھ کیا۔ چنانچہ بہت سے ممالک میں ان اداروں میں ضرورت کے مطابق بہت سی تبدیلیاں کی گئیں اور بعض ممالک میں نئے نئے شعبے اور ادارے قائم کیے گئے۔

کہا جاتا ہے کہ تاریخ سے بڑا استاد کوئی نہیں ہوتا۔ تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ آگ پورے پورے شہر تباہ کر چکی ہے۔ 8اکتوبر 1871ء کو شگاگو شہر کے ساتھ ایسا ہی ہوا تھا۔ یہ آگ چوبیس گھنٹے سے زائد وقت تک بھڑکتی رہی اور اس کے خوف سے بہت سے افراد دریا میں کود گئے اور ہلاک ہو گئے۔ اس واقعے میں تین سو افراد ہلاک اور نوے ہزار بے گھر ہوئے اور تقریباً دو سو ملین امریکی ڈالر کی مالیت کی جائیدادیں تباہ ہوئیں۔

8اپریل1906ء کو علی الصباح امریکہ میں آگ سے زبردست تباہی ہوئی۔ زبردست زلزلے کے باعث سان فرانسسکو کے مختلف حصوں میں گیس کے اسٹوو اور لیمپ الٹ جانے، بجلی کے تار ٹوٹ جانے اور گیس کی لائنیں پھٹنے سے آگ بھڑک اٹھی۔ پانی کی مرکزی لائنیں ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہونے کی وجہ سے آگ بجھانے والا عملہ موثر انداز میں آگ کے شعلوں پر قابو نہیں پا سکتا تھا، لہذا بلا کسی روک ٹوک کے تین یوم تک جگہ جگہ آگ بھڑکتی رہی۔ زلزلے اور آتش زدگی کے نتیجے میں 28ہزار سے زائد عمارتیں تباہ ہو گئیں۔ ڈھائی لاکھ افراد اپنے گھروں سے محروم ہو گئے اور تین ہزار افراد ہلاک ہوئے۔ اس واقعے کے نتیجے میں شہر کا زیادہ تر حصہ ملبے کا ڈھیر بن گیا اور 500 ملین امریکی ڈالر سے زائد مالیت کا نقصان ہوا۔

فائر سروس کا تصور صدیوں پرانا ہے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ رومیوں کے دور میں یہ سروس موجود تھی۔ اسی طرح یہ تصور بھی بہت قدیم ہے کہ شہر بسانے سے قبل اُن کی حفاظت کے لئے منصوبہ بندی کی جائے۔ لندن میں رومی حکومت کے دور میں اس سروس کا آغاز ہوا تھا۔ لیکن چوتھی صدی میں رومی سلطنت کے زوال کے بعد صدیوں تک لندن کے لوگ اس سروس سے محروم رہے پھر جب ولیم نے گیارہویں صدی میں لندن فتح کیا تو ''کرفیولا'' نافذ کیا۔ اس قانون کے تحت شہریوں پر لازم تھا کہ وہ شب میں آگ نہ جلائیں۔ جو شخص اس حکم کی خلاف ورزی کرتا اُس پر جرمانہ عائد کیا جاتا۔ یہ آتش زدگی کے واقعات سے بچاؤ کے ابتدائی اقدامات تصور کیے جاتے ہیں۔

----☆☆----

ڈاکٹر طارق ریاض خان (لاہور)

زرافہ

آپ نے یقیناً چڑیا گھر میں لمبی قدو قامت والے زرافے (Giraffe) دیکھے ہوں گے۔ رزافے کا سائنسی نام "GIRAFFA CAMELOPARDALIS" ہے۔ یہ دودھ پلانے والا سب سے درازقد جانور ہے۔ نرزرافہ 1200 کلو گرام اورمادہ زرافہ 830 کلو گرام وزنی ہوتا ہے۔ زرافے کی اُونچائی 14فٹ (4.3 میٹر) سے 17فٹ (5.2 میٹر) تک ہوتی

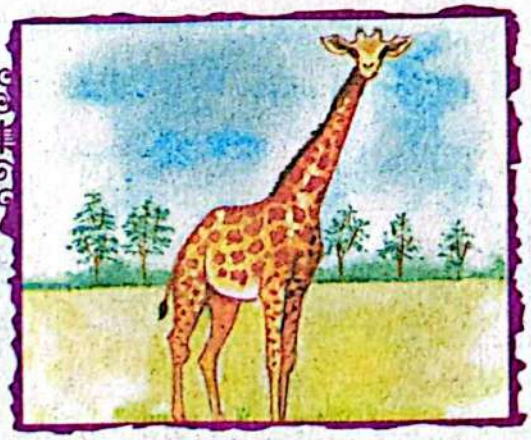

ہے۔ اب تک سب سے لمبا زرافہ 20فٹ (6 میٹر) ریکارڈ کیا گیا ہے۔ یہ جانور چاڈ، وسطی افریقہ اور جنوبی افریقہ میں پایا جاتا ہے۔ تحقیق سے معلوم ہوا کہ ان کی اوسط عمر13 سے 25برس تک ہو سکتی ہے۔ زرافے 55کلو میٹر فی گھنٹہ کی رفتار سے دوڑ سکتے ہیں۔ ان کی نیند لینے کا دورانیہ خاصا کم ہوتا ہے۔ یہ 24گھنٹے میں صرف دس منٹ سے دو گھنٹے تک سوتے ہیں۔ درختوں کے پتے اور پھل یہ شوق سے کھاتے ہیں۔ ان کی جان کو سب سے بڑا خطرہ شیروں سے ہوتا ہے جو مل کر شکار کو مار گراتے ہیں۔ مادہ زرافے کے سینگ چھوٹے ہوتے ہیں۔ یہ عموماً گروہ کی صورت میں رہنا پسند کرتے ہیں۔

آم

آم بلاشبہ پھلوں کا بادشاہ ہے۔ آم کا سائنسی نام "MANGIFERA INDICA" ہے۔ یہ پھل دُنیا کے 90 ممالک میں اُگایا جاتا ہے۔ اس کی سینکڑوں اقسام اب تک دریافت ہو چکی ہیں۔ آم کا درخت 35، 40 میٹر (115-131ft) لمبا ہوتا ہے۔ اس کی عمر خاصی ہوتی ہے۔ یہ درخت 200 برس تک پھل پیدا کرتا رہتا ہے۔ اس کی جڑ کو TAP ROOT کہتے ہیں جو 20فٹ گہری ہوتی ہے۔ آم کے پتے سدا بہار ہوتے ہیں جن کی لمبائی 15 تا 35 سینٹی میٹر اور چوڑائی 6 سے 16 سینٹی میٹر ہوتی ہے۔ دل چسپ امر یہ ہے کہ انسان 5 قبل مسیح بھی اس پھل کا شوقین تھا۔ مشرقی ایشیاء میں اس وقت بھی اسے شوق سے کھایا جاتا تھا۔ آم قدرت کا بے نظیر تحفہ ہے۔ 100 گرام آم میں 17.00 گرام نشاستہ،

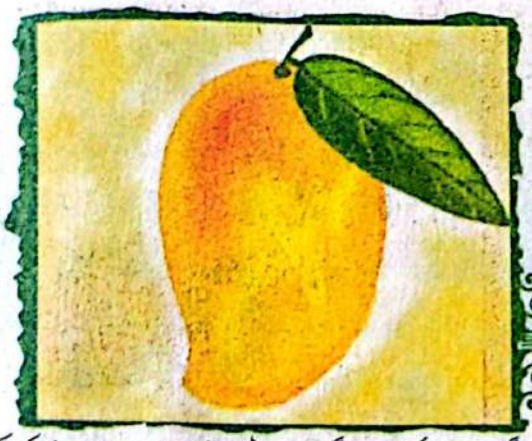

0.27 گرام چکنائی، 0.51 گرام پروٹین کے علاوہ وٹامن بی کی کئی اقسام، وٹامن A، کیلشیم، آئرن میگنیشم، فاسفورس، پوٹاشیم اور زنک بھی پایا جاتا ہے۔ اقوام متحدہ کے ادارے FAO کے مطابق سن 2007ء میں دُنیا بھر میں کُل 33000000ٹن آم کی پیداوار ہوئی تھی۔ جس میں 1719180ٹن آم پاکستان میں پیدا ہوا تھا۔ دُنیا میں سب سے زیادہ آم بھارت میں پیدا ہوتے ہیں۔ اس کے بعد چین، میکسیکو، تھائی لینڈ اور پاکستان کا نمبر آتا ہے۔ پاکستانی آم ذائقے کے اعتبار سے سب پہ بھاری ہیں۔

کار ریس

سپورٹس چینل پر اکثر آپ نے تیز رفتار گاڑیوں کو بھاگتے دیکھا ہو گا۔ یہ کھیل دُنیا کے متعدد ملکوں میں بڑے زور شور سے کھیلا جاتا ہے۔ جن میں امریکہ، برطانیہ، فرانس، آسٹریلیا اور جاپان خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔ کاروں کی ریس کا پہلا مقابلہ فرانس کے شہر پیرس میں 28 اپریل 1887ء کو ہوا تھا۔ لوگوں کی اس مقابلے میں دل چسپی دیکھتے ہوئے 1895ء میں باضابطہ کار ریس کا مقابلہ ہوا۔ یہ دُنیا کا پہلا مقابلہ تھا جو کسی قانون وضابطے کے تحت ہوا تھا۔ یہ مقابلہ امریکہ کی ریاست WISCONSIN میں MILWAUKEE موٹر ریس کے نام سے کھیلا گیا۔ اس کے پہلے فاتح " EMILE LEVASSOR" تھے۔ انہوں نے 48 گھنٹے میں 732 میل کا فاصلہ طے کر کے یہ مقابلہ جیتا۔ ٹیلی ویژن پر آپ سپورٹس کاروں کی جو دوڑ د ۔ اس کا آغاز 1923ء سے ہوا تھا۔

اب ہر سال پاکستان میں بھی صوبہ سندھ سے بلوچستان کے علاقے تک کار ریس کا مقابلہ ہوتا ہے۔

ہائیڈرو فوبیا

دُنیا میں شاید ہی کوئی ایسا انسان ہو گا جسے کسی چیز سے ڈر نہ لگتا ہو۔ خوف سے ہر کوئی واقف ہے۔ تاہم وہ لوگ جن کا خوف اُن کے اپنے ذہن کی پیداوار ہو، ماہرین اُسے فوبیا کہتے ہیں۔ یہ لاطینی زبان کا لفظ ہے جس کا مطلب ہے "خوف کھانا" البتہ ہائیڈرو فوبیا ایک جسمانی بیماری ہے جس کی وجہ ایک وائرس ہے۔ یہ وائرس جانور جیسے کتا وغیرہ کاٹ لے تو انسانی خون میں داخل ہو جاتا ہے۔ جانوروں میں اسے Rabies (ہلکا پن) کہا جاتا ہے جب کوئی کتا جسے عام طور پر پاگل کتا کہتے ہیں کسی انسان کو کاٹتا ہے تو جانور پہ شدید پاگل پن کا حملہ ہوتا ہے۔ حتی کہ جانور کی موت ہو جاتی ہے۔ دُوسری طرف جسے کتا کاٹتا ہے اُسے ہائیڈروفوبیا کی شکایت ہو جاتی ہے۔ اُسے پانی سے ڈر لگتا ہے۔ مشہور سائنس دان لوئس پاسچر (LOUIS PASTURE) نے پہلی مرتبہ اس مرض پہ تحقیق کی تھی۔ پاسچر نے 1885ء میں اس مرض کی پہلی ویکسین تیار کی۔ LYSSAVIRUS نامی وائرس دماغ کے سیلز کو متاثر کرتا ہے۔ متاثرہ شخص خوراک نگلنے میں مشکل محسوس کرتا ہے۔ سانس بھرپور نہیں لے سکتا اور موت کی وادی میں جا سوتا ہے۔ دُنیا بھر میں Rabies کا عالمی دن ہر سال 28 ستمبر کو منایا جاتا ہے۔

مختصر معلومات

- موتیوں کا جزیرہ بحرین کو کہا جاتا ہے۔
- خوشبوؤں کا شہر پیرس کو کہا جاتا ہے۔
- گلابوں کا شہر شیراز کو کہا جاتا ہے۔
- ہوٹلوں کا شہر بیروت کو کہا جاتا ہے۔
- شاہینوں کا شہر سرگودھا کو کہا جاتا ہے۔
- روشنیوں کا شہر کراچی کو کہا جاتا ہے۔
- زمین کی جنت کشمیر کو کہا جاتا ہے۔

☆ایک مچھر کا بچہ پہلی بار اُڑا۔ وہ اڑ کر واپس آیا تو اس کے ابو نے پوچھا۔
"کیسا لگا بیٹا!"
بچہ: "بہت مزہ آیا! ہر کوئی مجھے دیکھ کر تالیاں بجا رہا تھا۔"
(محمد سعد افراہیم، کراچی)

☆مالک نوکر سے: "نہ تمہیں کھانا پکانا آتا ہے، نہ صفائی کرنا، نہ کپڑے دھونا، آخر تمہیں کیا آتا ہے؟"
نوکر: "جی مجھے پسینہ آتا ہے۔" (علی حسن احمد، لاہور)

☆تین دوست اپنی بہادری کے قصے سنا رہے تھے۔
پہلا دوست: "میں نے کل بلی کی دُم پکڑ لی تھی۔"
دُوسرا دوست: "یہ تو کچھ بھی نہیں میں نے تو سانپ کو اپنے ہاتھوں سے پکڑا ہے۔"
تیسرا دوست: تم دونوں تو بہت ڈرپوک ہو، میں نے کل ایک شیر کو لات ماری اور وہ دُور جا گرا پھر میں نے گینڈے کے بہت زور سے مکا مارا اور ہاتھی کے دانت توڑ دیئے۔"
دونوں دوست (حیران ہوتے ہوئے) "اور پھر کیا ہوا؟"
تیسرا دوست: "پھر کھلونوں کی دُکان والے انکل نے مجھے دُکان سے باہر نکال دیا۔" (حاشر احمد، کراچی)

☆باپ (بیٹوں سے) "اس وقت کیا بجا ہے؟"
چھوٹا بیٹا: "تین بجنے میں پندرہ منٹ ہیں۔"
منجھلا لڑکا: "نہیں ابا جان! دو بج کر پینتالیس منٹ ہوئے ہیں۔"
بڑا لڑکا: "یہ دونوں غلط کہتے ہیں، اصل میں پونے تین بجے ہیں۔" (رامین مہتاب، چشمہ، میاں والی)

☆خریدار: "ایک کیلا کتنے روپے کا ہے؟"
دُکان دار: "پانچ روپے کا۔"
خریدار: "ایک کیلا دو روپے کا دیتے ہو؟"
دُکان دار: "دو روپے میں تو اس کا چھلکا ملے گا۔"
خریدار: "یہ لو تین روپے اور کیلے کا چھلکا اتار لو۔"
(عمر حیات، شمالی وزیرستان)

☆امیدوار سے فیکٹری کے منیجر نے پوچھا۔
"میاں تمہاری تعلیم کیا ہے؟"
امیدوار: "جناب پی پی ایم ایف۔"
منیجر: "یہ کون سی ڈگری ہے؟"
امیدوار: "جناب! پرائمری پاس مڈل فیل۔"
(نمرہ شاہین، ہڈالی)

☆ایک بھکاری دونوں ہاتھوں میں ایک ایک کشکول اٹھائے بھیک مانگ رہا تھا۔
ایک راہ گیر نے پوچھا: "بابا! یہ دونوں ہاتھوں میں کشکول کیوں اٹھا رکھے ہیں؟"
فقیر نے جواب دیا: "بڑھتے ہوئے کاروبار کی وجہ سے میں نے ایک اور برانچ کھول لی ہے۔"
(قمر ناز دہلوی، کراچی)

☆استاد: (شاگرد سے) "کنجوس کی تعریف کرو۔"
شاگرد: "سر! کنجوس تو تعریف کے قابل ہی نہیں ہوتا۔"
(شہزاد محسن، اٹک)

☆ایک دفتر میں مشاعرے کا انتظام کیا گیا۔ ایک افسر نے اپنا کلام سنانا شروع کیا۔ "دو موزے"
ماتحتوں کی واہ واہ کی آوازیں آنے لگیں۔ افسر نے پھر جھوم کر پڑھا۔ "دو کمبل۔" ماتحت بولے: "واہ کیا کہنے؟"
افسر جوش میں آگیا: "دو ہی پتلونیں۔"
آوازیں آئیں: "بہت خوب، بھئی بہت خوب"
افسر چونکتے ہوئے بولا: "اوہو! یہ تو دھوبی کے حساب کی پرچی ہے۔"
(واجد نگینوی، کراچی)

معلوماتِ عامہ

☆پاکستان کے ممتاز ادیب اور محقق سید قاسم محمود کا انتقال 30 مارچ 2010ء کو لاہور میں ہوا۔

☆پاکستان ٹیلی ویژن کی پہلی خاتون مینجنگ ڈائریکٹر رعنا شیخ تھیں۔

☆پاکستان میں بننے والی پہلی جیپ کا نام نشان اور ٹریکٹر کا نام باغبان ہے۔

☆پاکستان کی سب سے پہلی خاتون وزیر اعظم اور کم عمر وزیر اعظم محترمہ بے نظیر بھٹو تھیں۔

☆ پاکستان کا سرد ترین مقام زیارت ہے۔

☆ پاکستان کا گرم ترین مقام جیکب آباد ہے۔

☆ پاکستان کی سب سے خوب صورت جھیل سیف الملوک وادیٔ کاغان میں ہے۔

☆پاکستان کے پہلے ڈاک ٹکٹ پر تصویر کشی عبدالرحمٰن چغتائی نے کی تھی۔

☆ڈاکٹر ملیحہ لودھی دو مرتبہ امریکہ میں پاکستان کی سفیر مقرر ہوئیں۔

(محمد خلیل چودھری، دینہ)

☆اُردن کا قومی ترانہ صرف چار سطور پر مشتمل ہے۔

☆کنگرو آسٹریلیا میں پایا جاتا ہے اور آسٹریلوی زبان میں کنگرو کا مطلب ہے "میں نہیں جانتا۔"

☆انسانی جسم میں اگر خون کا دباؤ کم ہو جائے تو نبض کی رفتار بڑھ جائے گی۔

☆کھجور ایسا پھل ہے جس میں میگنیشیم، لوہا، فاسفورس اور گندھک پائی جاتی ہے۔

☆پاکستان کے علاوہ بحرین ایسا ملک ہے جس کا یومِ آزادی 14 اگست کو منایا جاتا ہے۔

☆دُنیا کا سب سے بڑا جزیرہ گرین لینڈ ہے۔

☆ قرآن مجید کے پہلے حافظ حضرت عثمان غنیؓ تھے۔

☆سال کا مختصر ترین دن 22 دسمبر ہوتا ہے۔

☆آنسوؤں میں سوڈیم کلورائیڈ پایا جاتا ہے۔

☆ہر سال 21 جون طویل ترین دن ہوتا ہے۔

☆پاکستان کی طرف سے ٹیسٹ کرکٹ میں پہلا رن نذر محمد نے بنایا تھا۔

☆ہاکی کے میدان کی لمبائی 100 گز اور چوڑائی 60 گز ہوتی ہے۔

(قمر ناز دہلوی، کراچی)

☆پاکستان میں ایٹمی میزائلوں کا پہلا تجربہ 5 فروری 1989ء کو حتف اول اور 11 فروری کو حتف دوم داغ کر لیا گیا۔

☆عنزہ اول اور عنزہ دوم 14 فروری 1989ء کو داغے گئے۔

☆غوری اول اپنے ہدف کو 1500 کلومیٹر اور غوری دوم 2200 کلو میٹر تک نشانہ بنا سکتا ہے۔

☆پاکستان کے ایٹمی تجربوں کو 5.00 ریکٹر سکیل پر ریکارڈ کیا گیا تھا۔

☆حتف سوم 2 فروری 2000ء کو چھوڑا گیا اور اس کی رینج 100 کلو میٹر ہے۔

(محمد عمیر بن قمر، رحیم یار خان)

☆قبیلہ قریش نے جب خانہ کعبہ کی دوبارہ تعمیر کی تو اُس وقت حضور اکرمؐ کی عمر چالیس سال تھی۔

☆مسلمان ریاضی دان محمد موسیٰ خوارزمی کو علم الجبرا کا بانی تسلیم کیا جاتا ہے۔

☆ابو یوسف یعقوب بن اسحاق مشہور سائنس دان اور فلسفی کا اصل نام الرازی تھا۔

☆اسلامی جمہوریہ پاکستان 27 رمضان 1366 ھجری کو وجود میں آیا۔

☆محترمہ فاطمہ جناح کا انتقال 31 جولائی 1967ء کو ہوا تھا۔

☆پاکستان کا پہلا آئین 1956ء میں نافذ ہوا۔

(واجد نگینوی، کراچی)

گولی

خلیل جبار (حیدر آباد)

حارث نے ایک میڈیکل اسٹور پر اپنے دوست کاشف کو رکنے کا اشارہ کیا۔

"کیوں کیا ہوا؟" کاشف نے پوچھا۔

"میڈیکل اسٹور سے دوا لینی ہے۔" یہ کہتے ہوئے حارث میڈیکل اسٹور کی جانب بڑھ گیا۔ پھر دوا لے کر اُس نے جیب میں رکھ لی۔

"کیا تمہارے گھر میں کوئی بیمار ہے؟" کاشف نے پوچھا۔

"یار گھر میں کوئی بیمار نہیں ہے یہ دوا میں نے اپنے لیے لی ہے۔" حارث نے بتایا۔

"کیا ہوا ہے تمہیں؟ ان دنوں تم کچھ زیادہ دوا کا استعمال کر رہے ہو۔" کاشف نے کہا۔

"شام کے وقت کرکٹ میچ کھیلنے سے تھکن بہت ہو جاتی ہے اس لیے فوری طور پر توانائی کو بحال رکھنے کی گولی کا استعمال کر لیتا ہوں، میں تمہیں جو چاق وچوبند نظر آتا ہوں یہ ان ہی گولیوں کا نتیجہ ہے۔"

حارث کی عادت تھی وہ ہر دم تروتازہ رہنا چاہتا تھا۔ اس لیے معمولی معمولی تکلیف یا تھکن کا احساس ہونے پر دوا کھا لیتا تھا۔ اِس کا حافظہ بہت تیز تھا۔ اسے گولیوں کے نام فوراً یاد ہو جاتے تھے۔ اسے جس وقت کسی گولی کی ضرورت محسوس ہوتی وہ فوراً اسٹور سے جا کر خرید لیتا تھا۔ اِس کا ایک دوست جواد میڈیکل اسٹور پر کام کرتا تھا وہ اپنے دوست سے نئی نئی گولیوں کے بارے میں معلومات لیتا رہتا تھا۔ اسی بنا پر حارث کو گولیوں کے بارے میں خاصی معلومات رہتی تھیں۔ ہر وقت اس کی جیب میں ٹافیوں کی بجائے سر درد، بخار، نزلہ اور فلو کی گولیاں موجود رہتی تھیں۔ اس وجہ سے وہ دوستوں میں "گولی" کے نام سے مشہور ہو گیا تھا۔ اس کے دوست بھی حیران تھے کہ وہ ایسی کڑوی گولیاں کھا کیسے لیتا ہے۔

"حارث میرا مشورہ مانو گے۔"

"تم بھی مشورہ دیتے ہو مجھے معلوم نہیں تھا، چلو بتا دو کیا مشورہ دینا چاہتے ہو؟" حارث نے کہا۔

"تم ادویات کا زیادہ استعمال نہ کیا کرو اور ڈاکٹر کے مشورے کے بغیر کوئی دوا استعمال نہ کیا کرو۔" کاشف نے کہا۔

"بس رہنے دو، ان ڈاکٹروں نے لوٹ مار کا بازار گرم کر رکھا ہے۔ ان سے کوئی بھی دوا لینے جاؤ پہلے تین دن تک ایسی دوا دیتے ہیں کہ آرام بالکل نہیں آتا جب ان سے احتجاج کرو تب اچھی دوا دیتے ہیں، جب مجھے معلوم ہے کہ درد کے لیے کون سی دوا ہے۔ نزلہ، زکام اور بخار میں کیسی دوا استعمال ہوتی ہے پھر میں ڈاکٹر کے پاس کیوں جاؤں۔" حارث نے کہا۔

"ڈاکٹر سے مشورہ کر لینا اچھا ہوتا ہے۔" کاشف نے کہا۔

"تم ڈاکٹروں کی زیادہ حمایت نہ کرو میں سب جانتا ہوں ان ڈاکٹروں کے بارے میں، ان کی غفلت اور لاپرواہی سے

کئی مریض اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں میرے کزن حنیف کو ایک ایسی دوا لکھ دی تھی کہ جس کے کھانے سے اس کا ایک ہاتھ بالکل مفلوج ہو گیا تھا۔"

"ڈاکٹر نے جو دوا تمہارے کزن حنیف کو لکھ کر دی تھی وہ اُس نے میڈیکل اسٹور سے خرید کر ڈاکٹر کو دکھائی تھی؟"

"نہیں، یہی غلطی اُس سے ہوئی تھی، ڈاکٹر صاحب کا کہنا ہے کہ اُس نے جس کمپنی کی دوا لکھ کر دی تھی میڈیکل اسٹور والے نے وہ دوا دینے کی بجائے دُوسری کمپنی کی دوا دے دی تھی۔ وہ دوا ری ایکشن کر گئی تھی۔"

"اسی لیے تو کہتے ہیں کہ دوا کسی اچھے ڈاکٹر سے لو اور جو دوا ڈاکٹر لکھ کر دے اُسے کھانے سے پہلے ڈاکٹر کو ایک نظر دکھا دو۔" کاشف نے کہا۔

"چھوڑو یار! تم یہ کس خشک موضوع پر گفتگو کرنے لگ گئے ہو۔" حارث نے بے زاری سے کہا۔

کاشف کو حارث سے اس طرح کے رویئے کی امید نہیں تھی۔ حارث کے اس جملے پر کاشف کو اپنی سبکی محسوس ہوئی تھی، اس لیے اُس نے خاموشی اختیار کر لی اور دل میں فیصلہ کر لیا کہ وہ اب حارث کو نہیں سمجھائے گا اس کا جو دل چاہے وہ کرے۔

ایک دن حارث کو پیٹ میں ہلکا ہلکا درد محسوس ہوا۔ وہ فوراً میڈیکل اسٹور پر گیا اور پیٹ کے درد کی گولی مانگی۔ اُس وقت میڈیکل اسٹور پر بڑی عمر کا ایک آدمی بیٹھا ہوا تھا۔ دوا کا نام سن کر اُس نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور بولا۔

"دوا کی پرچی دکھاؤ۔"

"میرے پاس پرچی نہیں ہے مجھے ویسے ہی نام یاد ہے۔" حارث نے کہا۔

"کیا تم کسی ڈاکٹر کے پاس کام کرتے ہو؟"

"مجھے کیا ضرورت ہے ڈاکٹر کے پاس کام کرنے کی، میں ابھی تعلیم حاصل کر رہا ہوں اور یہ دوا مجھے اپنے لیے چاہیے۔" حارث نے کہا۔

"اچھا، اچھا کسی ڈاکٹر نے تمہیں دوا لکھ کر دی ہو گی اور پرچی تم سے گم ہو گئی۔ یہی بات ہے نا۔" میڈیکل اسٹور والے نے کہا۔

"ہاں، ہاں وہ پرچی واشنگ مشین میں کپڑوں کے ساتھ دھل گئی تھی۔" حارث نے جھوٹ بولا۔

اس کو خطرہ تھا کہ کہیں میڈیکل اسٹور والا جو پولیس والوں کی طرح تفتیش کر رہا ہے کہیں اس کو دوا دینے سے انکار ہی نہ کر دے۔

گولی لے کر وہ سیدھا گھر پہنچا اور فوراً اُسے کھا لیا تاکہ فوری طور پر آرام آجائے۔ اُسے دوا کھائے ابھی تھوڑی دیر ہی گزری تھی کہ امی کی آواز کمرے میں آئی۔

"حارث بیٹا! ذرا جلدی سے بھاگ کر دہی لا دو۔"

"اچھا امی میں ابھی گیا اور ابھی آیا۔" حارث نے پیسے لیتے ہوئے کہا۔

ابھی وہ چند قدم ہی چلا تھا کہ اچانک اس کو چکر آیا اور وہ دھڑام سے فرش پر گر پڑا۔ امی نے فوراً لپک کر اس کو فرش سے اٹھایا۔ حارث اُس وقت تک بے ہوش ہو چکا تھا۔ تمام تر کوشش کے باوجود وہ ہوش میں نہیں آرہا تھا۔ ابا جان بھی کسی کام سے گھر آئے تھے وہ بھی حارث کو بے ہوش دیکھ کر گھبرا گئے اور فوری طور پر اس کو ہسپتال لے گئے۔ ہسپتال جانے سے اس کو بروقت طبی امداد ضرور مل گئی تھی لیکن وہ دو دن تک بے ہوش رہا۔ ڈاکٹر اس کو ہوش میں لانے کی پوری کوشش کر رہے تھے۔ لیکن ان کی ہر کوشش ناکام ہو چکی تھی۔ طویل بے ہوشی اس کی جان بھی لے سکتی تھی۔

تیسرے دن حارث نے آنکھیں کھول دیں اور اپنے آپ کو ہسپتال میں دیکھ کر وہ حیرانی سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔

"شکر ہے اللہ تعالیٰ کا کہ تمہیں ہوش آگیا۔"

امی جان کی آنکھوں میں خوشی سے آنسو آگئے۔ انہوں نے آگے بڑھ کر حارث کا ماتھا چوما۔

"مجھے کیا ہو گیا تھا؟" حارث نے امی اور ابو کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"تمہیں چکر آگیا تھا اور تم بے ہوش ہو کر گر پڑے

تھے۔" ابا جان نے بتایا۔

"مجھے چکر کیوں آگئے تھے حالانکہ میں بالکل صحت مند تھا۔ مجھے کوئی بیماری بھی نہیں ہے۔" حارث نے کہا۔

"ڈاکٹر صاحبان کا کہنا ہے تم نے کوئی ایسی دوا کھالی تھی جس کو تمہارے جسم نے قبول نہیں کیا اور دواری ایکشن کر گئی۔" ابا جان نے بتایا۔

"اچھا..... اچھا..... میڈیکل اسٹور والا اسی لیے گولی مانگنے پر پولیس کی طرح مجھ سے تفتیش کر رہا تھا اور اس کا زور تھا کہ میں پرچی دکھاؤں تاکہ اس کی تسلی ہو جائے کہ ڈاکٹر نے ہی وہ گولی مجھے لکھ کر دی ہے۔"

"حارث بیٹے! ڈاکٹر صاحبان بہت ناراض ہو رہے تھے اور کہہ رہے تھے بچے ہوں یا بڑے کسی کو بھی اپنی مرضی سے دوا اپنے کے لیے تجویز نہیں کرنی چاہیے، اس سے بڑا نقصان ہو سکتا ہے۔ بعض گولیاں ایسی بھی ہوتی ہیں کہ جن کے زیادہ استعمال سے جسم میں کینسر کا مرض پیدا ہو جاتا ہے بعض گولیاں گردوں کے مرض کا باعث بنتی ہیں۔ اس لیے ہمیشہ ڈاکٹر کی تجویز کردہ دوا کھانی چاہیے کیونکہ ڈاکٹر انسان کی جسمانی ساخت کو دیکھ کر دوا تجویز کرتے ہیں۔ ورنہ دوا فائدے کے بجائے نقصان کر جاتی ہے۔"

"ابا جان! میں واقعی غلطی پر تھا، معمولی تھکن اور سر درد پر گولیاں کا بے جا استعمال کرنا میرا معمول بن گیا تھا جس کی مجھے یہ سزا ملی ہے، میں اپنے جسم کو گولیوں کے استعمال سے فٹ رکھنا چاہتا تھا تاکہ میں ہر کام منٹوں میں کر سکوں۔ میرے دوست سمجھاتے تھے کہ میں گولیوں کا استعمال کرنے کی بجائے غذا سے اپنی توانائی کو بحال رکھوں لیکن میں غذا کو استعمال کرنے کے بجائے گولیوں پر انحصار کرنے لگا تھا۔ میں کوشش کروں گا کہ آئندہ ایسا نہ ہو۔" حارث نے شرمندہ ہوتے ہوئے کہا۔

"شاباش بیٹے! اپنی غلطی کو مان لینا ہی عقل مندی ہوتی ہے، مجھے اُمید ہے کہ آئندہ تم ایسی کوئی غلطی نہیں کرو گے اور ڈاکٹر کی تجویز کردہ دوا ہی استعمال کرو گے۔" ابا جان نے مسکراتے ہوئے کہا۔

سنہری باتیں

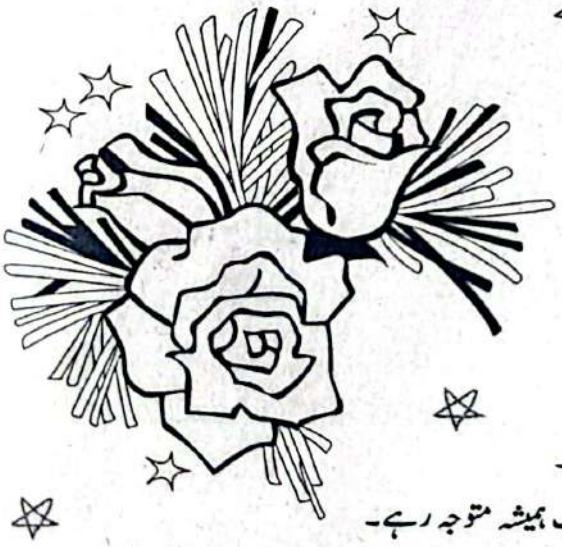

☆ ہمت سے زندگی بنتی ہے اور بے دلی سے موت۔
☆ مطالعہ غم اور اُداسی میں بہترین دوست ہے۔
☆ مسکراہٹ روح کا دروازہ کھول دیتی ہے۔
☆ جس دل میں برداشت ہو وہ کبھی ٹھوکر نہیں کھاتا۔
☆ حوصلہ کامیابی کی علامت ہے۔
☆ خوابوں کے اندر زندہ مت رہو، لیکن اپنے خوابوں کو زندہ رکھو۔
☆ عقل مند وہ ہے جو فضول بات پر دھیان نہ دے اور خدا کی طرف ہمیشہ متوجہ رہے۔
☆ ہمیشہ خدا سے ڈرتے رہو کیوں کہ خوفِ خدا سے دل نرم ہو جاتا ہے۔
☆ خوش کلامی ایسا پھول ہے جو کبھی نہیں مرجھاتا۔
☆ خاموشی غصے کا بہترین علاج ہے۔
☆ دوزخ سے نجات چاہتے ہو تو خلقِ خدا کی خدمت کو اپنا شعار بناؤ۔

عینی ایمان، ساہی وال

جنگل کا بادشاہ

محمد عارف عثمان (لاہور)

وہ منگل کا دن تھا۔ میں ''دی جنگل'' ٹی وی کے اسٹوڈیو پہنچا تو میڈم کیتھرین، جو افریقہ میں ''دی جنگل'' ٹی وی کی اسٹیشن ڈائریکٹر ہیں، نے مجھے بلا لیا۔ میں جب اُن کے کمرے میں داخل ہوا تو وہ چائے پینے اور کچھ تصویریں دیکھنے میں مصروف تھیں۔ حال احوال پوچھنے کے بعد انھوں نے میرے لیے بھی چائے منگوائی اور جو تصویریں وہ دیکھ چکی تھیں وہ میری طرف بڑھاتے ہوئے مجھ سے یوں مخاطب ہوئیں۔

''مسٹر پیٹر براؤن! میں چاہتی ہوں کہ آپ ہمارے لیے ایک ایسی فلم تیار کریں جس میں جنگل کے بادشاہ شیر کو مختلف جانوروں کا شکار کرتے ہوئے دکھایا گیا ہو۔''

''آل رائیٹ میڈم! آپ کے حکم کی تعمیل ہو گی۔'' میں نے تصویروں کو بغور دیکھتے ہوئے شائستہ انداز میں جواب دیا۔ ان تصویروں میں شیر کو مختلف جانوروں کا شکار کرتے ہوئے دکھایا گیا تھا۔ کسی تصویر میں جنگلی گائے، کسی میں بھینس، کسی میں ہرن اور کسی تصویر میں بارہ سنگھا شیر کے مضبوط جبڑوں کی گرفت میں جکڑا ہوا نظر آ رہا تھا۔ ایک تصویر میں شیر ایک زرافے پر بہت لمبا جمپ لگا رہا تھا۔ یہ تصویر بہت خوب صورت تھی۔

''میرے خیال میں مجھے مزید کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ فلم کیسی ہونی چاہیے؟'' کچھ دیر بعد میڈیم کیتھرین بولیں۔

''جی..... جی میڈم! میں آپ کی پسند سمجھتا ہوں۔''

میں نے تصویریں ایک طرف رکھتے اور چائے کا گھونٹ بھرتے ہوئے کہا۔ چائے پی کر میں نے میڈم کیتھرین سے اجازت لی اور اپنے ساتھیوں جوزف، مائیکل، سوزانے اور رِیٹا کے ہمراہ جنگل کی طرف روانہ ہو گیا۔ سات آٹھ گھنٹوں کے سفر کے بعد شام چار بجے کے قریب ہم ایک جنگل میں پہنچ گئے۔ لنچ ہم نے دورانِ سفر ہی کر لیا تھا۔ سوزانے اور جوزف اپنا اپنا کیمرہ آنکھوں سے لگائے نہ جانے کب سے اپنے کام میں مصروف تھے۔

جنگل میں ابھی ہم تھوڑی دُور ہی گئے تھے کہ ہمیں

ہاتھیوں کی چنگھاڑ سنائی دی۔ ہم سب نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ ہمیں ہاتھی کہیں دکھائی نہ دیے۔ لمبی لمبی گھاس اور درختوں کی ایک لمبی قطار کو پیچھے چھوڑ کر ہم چند قدم اور آگے بڑھے تو ہمارے سامنے ایک چھوٹا سا میدان تھا اور اس میدان میں دو ہاتھیوں کو ایک شیر نے گھیر رکھا تھا۔ جو ہاتھی بھی آگے بڑھنے کی کوشش کرتا شیر اُس کا راستہ روک لیتا۔ ہاتھی اپنی سونڈ تلوار کی طرح لہراتے مگر شیر ہر بار بچ نکلتا۔ ہاتھی دو تھے اور شیر ایک، اس کے باوجود شیر ذرا بھی مرعوب یا خوفزدہ نظر نہیں آتا تھا۔ تنگ آ کر ہاتھی شیر کو ڈرانے کے لیے چنگھاڑنے لگے تھے۔ شیر بھی واقعی شیر ہی تھا۔ اُس پر ہاتھیوں کے چنگھاڑنے کا کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔ میں یہ منظر دیکھ کر دل ہی دل میں خوش ہو رہا تھا۔ میری خوشی کی وجہ یہ تھی کہ جنگل میں پہنچتے ہی محض اتفاق سے بغیر کسی انتظار اور کوشش کے ہمیں یہ دلچسپ منظر دیکھنے اور ریکارڈ کرنے کو مل گیا تھا۔ عام حالات میں اس قسم کے منظر کی ریکارڈنگ کے انتظار میں ہمیں کئی گھنٹے بلکہ کئی دن بھی لگ سکتے تھے۔

کچھ دیر اسی طرح گزر گئی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ہاتھیوں کی جھنجھلاہٹ اور شیر کی بے باکی میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ شیر اب باقاعدہ ہاتھیوں پر حملے کرنے لگا تھا۔ شیر پھرتیلا تھا اور ہاتھی بہت موٹے اور بے حد سست تھے۔ اُن کے لیے شیر کی طرح تیزی سے حرکت کرنا ممکن نہ تھا۔ شیر جب حد سے بڑھنے لگا تو دونوں ہاتھی اکٹھے کھڑے ہو گئے۔ شیر جس طرف سے بھی آگے بڑھنے کی کوشش کرتا ہاتھی تھوڑی سی حرکت کرتے اور سونڈ لہرا کر شیر کو پیچھے ہٹنے پر مجبور کر دیتے۔ ایک ہاتھی نے شیر کو سونڈ مارنے کی کوشش کی تو شیر نے اپنا پنجہ آگے کر دیا۔ پنجہ لگتے ہی ہاتھی کی سونڈ زخمی ہو گئی اور اُس سے خون بہنے لگا۔ زخم زیادہ گہرے نہیں تھے لیکن بہرحال شیر ایک ہاتھی کو زخمی کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

ہم سب گاڑی سے اتر کر بڑے غور سے شیر اور ہاتھیوں کی یہ کش مکش دیکھ رہے تھے۔ جوزف اور سوزانے زاویے بدل بدل کر اس منظر کی ریکارڈنگ کر رہے تھے۔

اب شیر کا رُخ دُوسرے ہاتھی کی طرف تھا۔ آہستہ آہستہ سرکتا ہوا شیر خطرناک حد تک ہاتھی کے قریب پہنچ گیا۔ ہاتھی شدید غصے کے ساتھ شیر پر نظریں جمائے ہوئے تھے۔ اُس کے بس میں ہوتا تو وہ شیر کو کچا کھا جاتا۔ اچانک ہاتھی نے اپنی سونڈ سے شیر پر حملہ کر دیا۔ شاید ہاتھی کا خیال تھا کہ وہ شیر کو اپنی سونڈ سے اٹھا کر دُور پھینک دے گا مگر یہ اُس کی خام خیالی تھی۔ ہاتھی نے جونہی سونڈ لہرائی، شیر نے جھٹ سے منہ کھولا اور ہاتھی کی سونڈ پکڑ لی۔ سونڈ شیر کے دانتوں کی گرفت میں آتے ہی ہاتھی بلبلا اُٹھا۔ اُس نے زور زور سے سر کو ہلایا اور جھٹکے دے کر سونڈ کو شیر سے چھڑانے کی کوشش کی۔ ہاتھی کے جھٹکوں سے شیر اچھا خاصا ہل کر رہ گیا مگر اُس نے سونڈ کو نہ چھوڑا۔ اب تو ہاتھی کی جان پر بن آئی تھی۔ وہ تکلیف کے مارے پاگل ہو رہا تھا اور اپنے سر کو دائیں بائیں جھٹک رہا تھا۔ اُس کی سونڈ کا جو حصہ شیر کے منہ میں تھا وہ لہولہان ہو چکا تھا۔ شیر کا منہ بھی ہاتھی کے خون سے بھر گیا تھا۔ درد کی شدت اتنی تھی کہ ہاتھی کے منہ سے خود بخود عجیب و غریب آوازیں نکل رہی تھیں۔ شیر نے ہاتھی کو بے بس کر کے رکھ دیا تھا۔

اس موقع پر اگر دُوسرا ہاتھی اپنے ساتھی کی مدد کو نہ آتا تو یقیناً پہلا ہاتھی تھوڑی دیر بعد دھڑام سے زمین پر گر جاتا۔ دُوسرے ہاتھی کو اپنی جانب بڑھتے دیکھ کر شیر بھاگ کھڑا ہوا لیکن جاتے جاتے وہ ہاتھی کی سونڈ کا اچھا خاصا گوشت لے اُڑا تھا۔

ہاتھی کی سونڈ سے خون کی دھار سی جاری تھی اور وہ اذیت سے تڑپ رہا تھا۔ ابھی ایک منٹ بھی نہ گزرا تھا کہ ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے شیر دوڑتا ہوا واپس آیا اور پیچھے سے دُوسرے ہاتھی پر جھپٹ پڑا۔ شیر ہاتھی سے مقناطیس کی طرح چمٹ گیا تھا اور اُس کے دانت اور پنجے ہاتھی کے جسم میں اتر گئے تھے۔ بھاری بھر کم ہاتھی بڑی ہی بیچارگی کے ساتھ کبھی جھرجھری لے کر اور کبھی جھٹکے دے کر خود کو شیر سے آزاد

کرانے کی جدوجہد کر رہا تھا۔ وہ بار بار چنگھاڑتا اور اپنی سونڈ کو اپنی کمر پر مارتا مگر اُس کی سونڈ اُس کی پشت تک نہیں پہنچ سکتی تھی۔ پہلا ہاتھی چند قدم دُور اپنے زخم سہلا رہا تھا اور دُوسرے کو شیر نے اس طریقے سے پکڑ رکھا تھا کہ وہ کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ خوف ہاتھی کی آنکھوں میں صاف دکھائی دے رہا تھا۔ آخر کار چند ہی منٹوں کے بعد ہاتھی کی ہمت جواب دے گئی اور وہ زمین پر آ رہا۔ شیر نے فوراً اُس کی گردن پر دانت جما دیے۔ ہاتھی کو زمین پر گرتے اور تڑپتے دیکھ کر اُس کا ساتھی جیسے ایک دم نیند سے جاگ اُٹھا۔ وہ شیر کی طرف لپکا۔ شیر نے ایک لمحے کے لیے اُس کی طرف دیکھا اور بجلی کی سی تیزی کے ساتھ اُس پر حملہ آور ہو گیا۔ شیر کے پنجے سیدھے ہاتھی کی آنکھوں پر پڑے۔ ہاتھی کو شیر سے اس قسم کے سلوک کی بالکل توقع نہیں تھی۔ وہ ہڑبڑا کر رہ گیا اور کراہتے ہوئے زمین پر گر پڑا۔ ہماری آنکھوں کے سامنے شیر نے آناً فاناً ہاتھی کو اُدھیڑ کر رکھ دیا۔ اب دونوں ہاتھی نیم مُردہ حالت میں پڑے آخری سانسیں لے رہے تھے۔ شیر ہاتھیوں کی چند بوٹیاں کھا کر بے نیازی سے چلتا ہوا جنگل میں غائب ہو گیا۔ ہم وہیں موجود رہے۔ تقریباً آدھے گھنٹے کے بعد کہیں سے تین لومڑیاں نمودار ہوئیں اور مُردہ ہاتھیوں کی طرف بڑھنے لگیں۔ جب وہ پیٹ بھر کر کھا چکیں تو وہ وہاں سے چلی گئیں۔

اب شام ہونے لگی تھی۔ ہم آگے بڑھے۔ ہمیں جنگل کے مختلف جانور تو دکھائی دیے مگر وہ شیر دوبارہ نظر نہیں آیا تھا۔ یقیناً اب اُسے فوری طور پر شکار کی کوئی حاجت نہیں رہی تھی۔ رفتہ رفتہ رات کا اندھیرا گہرا ہونے لگا۔ جوں جوں اندھیرا بڑھ رہا تھا جنگل کی پُراسراریت بھی بڑھتی جا رہی

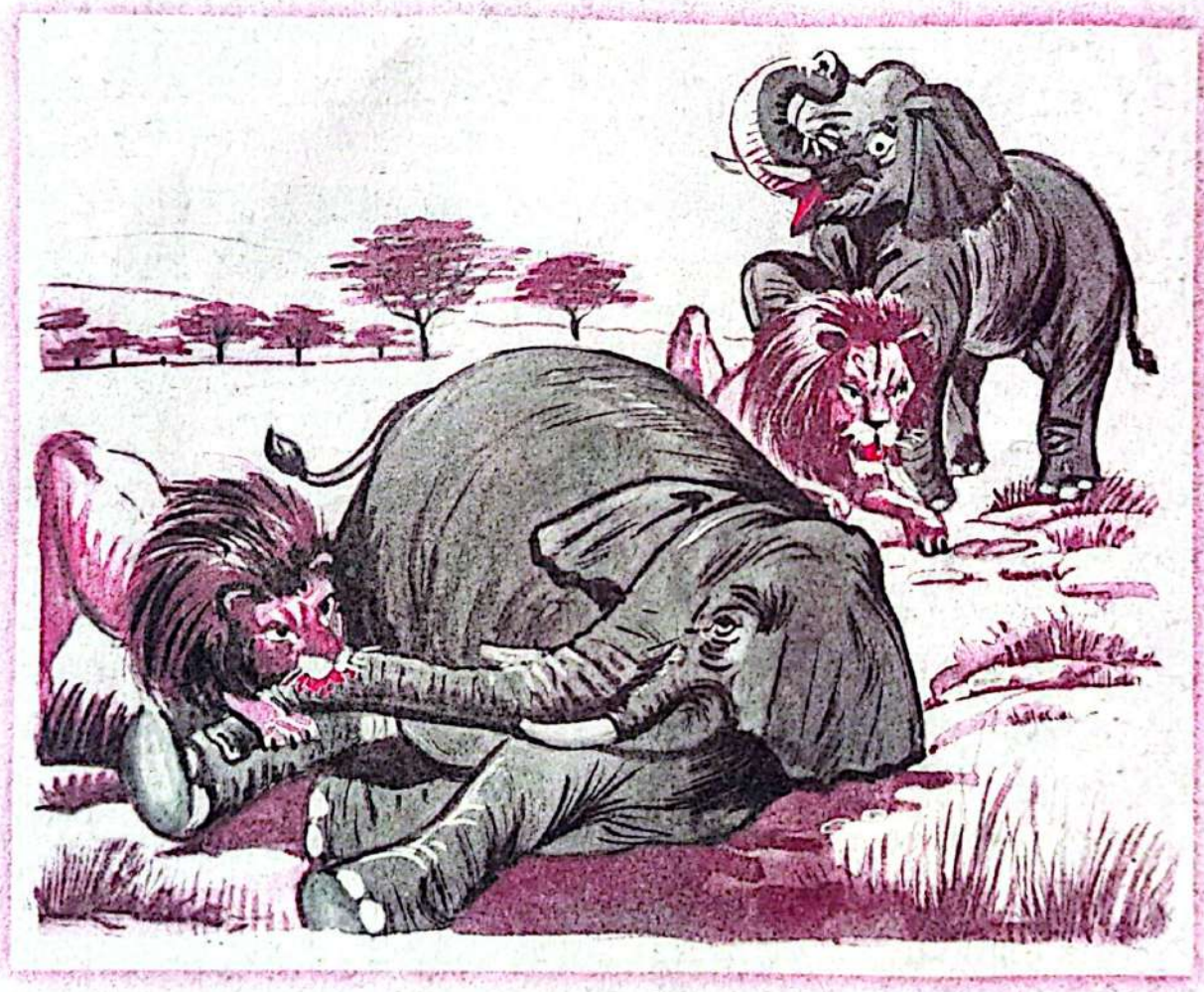

تھی۔ یہ جنگل خاصا بڑا تھا۔ ہم تقریباً آدھی رات تک جنگل میں گھومتے رہے۔ اس دوران کوئی خاص واقعہ پیش نہیں آیا تھا۔ درختوں اور جھاڑیوں وغیرہ سے قدرے فاصلے پر ایک بہتر جگہ دیکھ کر سوزانے نے کھانے کی تجویز پیش کی۔ میں نے گاڑی روک دی۔ ریٹا اور مائیکل دستر خوان بچھانے لگے۔ آسمان بالکل صاف تھا۔ حدِ نگاہ تک ستارے چمک رہے تھے۔ چاند بھی پوری طرح روشن تھا اور اس کی چاندنی میں ہر چیز واضح دکھائی دے رہی تھی۔ ذرا سی دیر میں کھانا لگ گیا اور ہم سب کھانا کھانے لگے۔ ہم کھانا ابھی کھا رہے تھے اور کسی بھی قسم کے خطرے سے نمٹنے کے لیے پوری طرح چوکس بھی تھے۔ ابھی میں نے پہلا ہی لقمہ لیا تھا کہ مائیکل کی آواز پر ہم سب چونک پڑے۔

"شش..... شش ..... شیر۔" مائیکل نے دبی دبی آواز میں مجھے متوجہ کیا۔

میں نے پلٹ کر دیکھا۔ کچھ دُور ایک زیبرا بھاگا جا رہا تھا۔ شیر اُس کے پیچھے پیچھے تھا۔ میں پہلی نظر میں ہی جان گیا کہ یہ وہ شیر نہیں تھا جسے ہم نے دن کے وقت ہاتھیوں کو شکار کرتے ہوئے دیکھا تھا۔ ہم کھانا بھول گئے۔ جوزف اور سوزانے نے فوراً کیمرے سنبھال لیے۔ آدھی رات کو زیبرا نہ جانے کس طرح شیر کے چنگل میں پھنس گیا تھا۔ شاید وہ اپنے ساتھیوں سے بچھڑ گیا تھا۔ زیبرا پوری رفتار سے بھاگ رہا تھا لیکن شیر کی رفتار اُس سے کہیں زیادہ تھی۔ وہ ہوا میں چھلانگیں لگاتا ہوا زیبرے کے قریب پہنچ چکا تھا۔ ہماری گاڑی سے چند قدم کے فاصلے پر شیر نے چھلانگ لگائی اور سیدھا زیبرے کے اُوپر جا کر گرا۔ زیبرا بھی اُس کے ساتھ ہی گرا اور دوبارہ نہیں اُٹھ سکا۔ شیر نے زیبرے کو گردن سے پکڑ کر بے بس کر دیا تھا۔ موت سے آخری لڑائی لڑتے ہوئے خوف زدہ زیبرے کی ٹانگیں بُری طرح لرز رہی تھیں۔ شیر نے زیبرے کی گردن مروڑی اور اُس کا گوشت کھینچ کر کھانے میں مصروف ہو گیا۔ اسی دوران اُس کی نظر ہم پر پڑی۔ ہمیں دیکھتے ہی شیر سب کچھ بھول کر ہماری طرف متوجہ ہو گیا۔ پھر وہ ہماری طرف چل پڑا۔ شیر کو اپنی طرف آتے دیکھ کر میں نے فوراً گن سنبھالی اور شیر کا نشانہ لیا۔ شیر اب دوڑتا ہوا ہماری طرف آ رہا تھا۔ ریٹا اور مائیکل خوف سے چلا رہے تھے۔ شیر اور میرے درمیان مشکل سے چار پانچ قدم کا فاصلہ رہ گیا تھا کہ میں نے گولی چلا دی۔ جونہی میں نے گولی چلائی عین اُسی وقت شیر نے مجھ پر چھلانگ دی۔ میری گولی شیر کی دائیں ٹانگ میں لگی۔ میں فوراً زمین سے چمٹ گیا۔ شیر میرے اُوپر آ گرا۔ اُس کے پنجے لگنے سے میرا سر زخمی ہو گیا تھا۔ مجھے یوں لگا جیسے کسی نے میرے سر میں سوئیاں چبھو دی ہوں۔ میں نے اپنے ہوش و حواس قائم رکھتے ہوئے ایک بار پھر شیر کا نشانہ لیا۔ تاہم گولی چلانے سے پہلے ہی شیر نے مجھے دبوچ لیا۔ میری گن میرے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ اب شیر اور میں باقاعدہ گتھم گتھا ہو رہے تھے۔ ٹانگ زخمی ہونے کی وجہ سے اُس کا غصہ اپنی انتہا پر تھا۔ میں شیر کو جبڑوں سے پکڑنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کوشش میں میرے ہاتھ شدید زخمی ہو گئے تھے۔ شیر کے پنجوں نے مجھے لہولہان کر دیا تھا۔ شیر گرج رہا تھا اور مجھے ہڑپ کرنے کی زبردست جدوجہد کر رہا تھا۔ میری پینٹ کی بیلٹ میں شکاری خنجر اُڑسا ہوا تھا لیکن میرے ہاتھ فارغ نہیں تھے کہ میں خنجر سے کام لے سکتا۔

(اس کہانی کا دُوسرا اور آخری حصہ آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں)

انعام اور سزا

ہارون الرشید کے دربار میں ایک شخص پیش ہوا اور اپنا کمال دکھانے کے لئے ایک سوئی گاڑ دی اور دُور جا کر دُوسری سوئی پھینکی جو عین سوئی پر جا کر لگی۔ اُسے لوگوں نے خوب داد دی۔ خلیفہ نے حکم دیا کہ اِسے انعام بھی دیا جائے اور دس کوڑے بھی مارے جائیں۔ لوگوں نے وجہ پوچھی تو کہنے لگا کہ اس کی ذہانت قابلِ دید ہے لیکن اِس نے اپنا ذہن فضول کام میں صرف کیا، اس لئے یہ سزا کا مستحق ہے۔

(محمد مبین احمد، ساہی وال)

فرق تلاش کریں

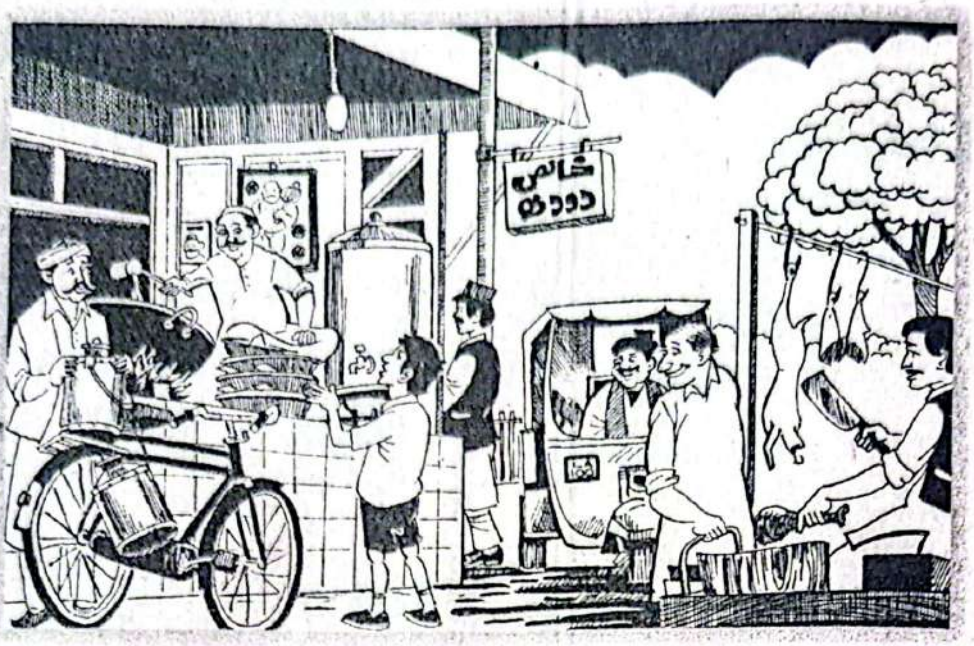

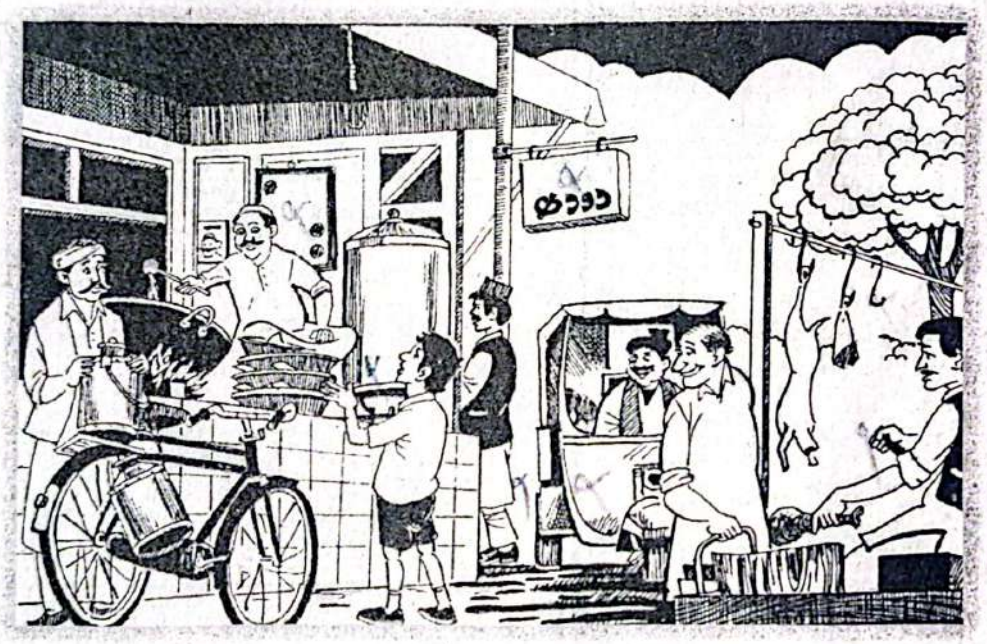

یہ دونوں تصاویر بظاہر ایک جیسی لگ رہی ہیں، لیکن ان میں دس جگہ پر فرق ہے۔

کیا آپ یہ فرق تلاش کر سکتے ہیں؟

مئی کے شمارے میں اُمید بہار رکھ، ایک عدالت ایسی اور بندگی سپرہٹ کہانیاں تھیں۔ میرے پسندیدہ اشعار اور بچوں کا انسائیکلوپیڈیا بہترین سلسلے ہیں۔ انہیں جاری رکھیے گا۔ مجھے "تعلیم وتربیت" سے بہت محبت ہے۔ ایسی محبت کہ جس میں پانچ سال گزر جانے کے باوجود ذرہ بھر بھی کمی نہیں آئی اور ان پانچ سالوں کے تمام شمارے میرے پاس موجود ہیں۔

(محمد عثمان قاسمی، جھنگ صدر)

اس بار تمام کہانیاں زبردست تھیں خاص طور پر گواہی اور سچ کی آواز عمدہ کہانیاں تھیں۔

(محمد ثوبان میر، گوجرانوالہ)

مئی کا شمارہ زبردست تھا۔ میری آپ سے گزارش ہے کہ قلمی دوستی کا سلسلہ پھر سے شروع کریں۔

(علی حیدر، تلہ گنگ)

کہانیوں میں چچا تیز گام شادی میں گئے، بندگی اور سچ کی آواز بہت اچھی تھیں۔ (صفورہ اصغی، کراچی)

چچا تیز گام بہت اچھی کہانی تھی۔ درس قرآن وحدیث، بچوں کا انسائیکلو پیڈیا اور مفید مشغلے بہت پسند آئے۔

(عبدالرحمٰن ذاکر، لاہور)

جب میں نرسری جماعت میں تھی تو ابو اجان پہلی مرتبہ "تعلیم وتربیت" لائے تھے، پہلے پہل تو امی جان مجھے کہانیاں پڑھ پڑھ کر سناتی تھیں۔ بعدازاں میں خود پڑھنے لگی۔ تعلیم وتربیت کا ہر شمارہ بہترین ہوتا ہے۔ ہر کہانی سبق آموز، ہر نظم مزے دار، ہر سلسلہ دل چسپ، آپ کا ہر اداریہ شان دار اور درسِ قرآن وحدیث کی تو تعریف کرنا سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہے۔

(بنت قاری تحسین سرور، لاہور)

یہ جان کر بہت خوشی ہوئی کہ ہمارا پیارا تعلیم وتربیت اللہ کے فضل وکرم سے 70 سال کا ہو گیا ہے۔ دل سے بس ایک ہی دُعا نکلتی ہے کہ اے اللہ! اس منفرد اور معلوماتی رسالے کا سفر صدیوں تک یونہی جاری رہے۔ معلوماتِ عامہ اور بچوں کا انسائیکلوپیڈیا کے سلسلے بہت اچھے جارہے ہیں۔

(فارحہ ظفر، رحیم یار خان)

شکر ہے کہ چچا تیز گام بھی پہنچ گئے۔ کہانی اتنی زبردست تھی کہ ہم سب ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو گئے۔ جنگل سے جنگل تک کا سلسلہ جاری رکھیں۔ آپ سے ایک گزارش ہے کہ کوئی قسط وار ناول شروع کریں۔

(وقار الحسن، دیپال پور)

☆ آپ کی فرمائش پوری کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

مجھے یہ دیکھ کر بہت دُکھ ہوا کہ پچھلے شمارے میں کوئی نعت شائع نہیں کی گئی اور اس بار بھی رسالے میں نعتِ رسول مقبول ﷺ نہیں تھی۔ جہاں آپ اتنی کہانیاں، نظمیں اور بہت کچھ شائع کرتے ہیں۔ وہاں نعتِ شریف بھی ضرور شائع کیا کریں۔

(علی عمران، لاہور)

☆ ہم ہر شمارے میں حمد یا نعت میں سے کوئی ایک چیز ضرور شائع کرتے ہیں۔

اپریل کا شمارہ بہت اچھا لگا۔ کہانیوں میں گواہی، ایک عدالت ایسی اور نیا سلسلہ چچا تیز گام بہت ہی اچھا ہے۔

(ہارون الرشید، جہلم)

کہانیوں میں چچا تیز گام پسند آئی۔ انکل! کیا میں نعت بھیج سکتا ہوں؟

(محمد ضیاء السلام سرکانی، ڈیرہ غازی خان)

☆ جی بھیج سکتے ہیں۔

مئی کے شمارے میں کہانیاں چچا تیز گام شادی میں گئے، ایک عدالت ایسی، چاند گاڑی، سچ کی آواز اور گواہی بہت اچھی لگیں۔ آپ کو بہت مبارک ہو کہ تعلیم وتربیت اب 70 سال کا بزرگ ہو گیا ہے۔ میں دُعا کرتا ہوں کہ یہ کئی سو سال کی زندگی پائے۔

(محمد احمد، راول پنڈی)

☆ آمین۔

مئی کا تازہ شمارہ اپنے مکھڑے پر چچا تیز گام کی تصویر لیے ہوئے ملا۔ مزاحیہ کہانی "چاند گاڑی" پسند آئی۔ تعلیم وتربیت میں انٹرویوز کا سلسلہ بھی شروع کیا جانا چاہیے۔

(مقصود احمد منظر، لاہور)

مئی کے شمارے میں تمام کہانیاں اپنی مثال آپ تھیں۔ میں ماہنامہ تعلیم وتربیت بہت شوق سے پڑھتی ہوں اور تقریباً دو سال سے اس کی قاریہ ہوں۔ سلسلہ "بچوں کا انسائیکلو پیڈیا" بہت پسند آیا۔

(میمونہ مقدس، ساہی وال)

کھیل دس منٹ کا بہت مزے دار تھا۔ معلوماتِ عامہ بھی پسند آئیں۔ (محمد ریحان صفدر، ڈیرہ غازی خان)

مئی کا شمارہ دیکھ کر دل خوش ہو گیا۔ تمام کہانیاں زبردست اور اپنی مثال آپ تھیں خصوصاً گواہی، سچ کی آواز، چاند گاڑی، بندگی اور ایک عدالت ایسی بہت پسند آئیں۔ چچا تیز گام نے واقعی دھوم مچادی۔

(حمنی عظیم، لاہور)

"تعلیم وتربیت" کے 69 سال مکمل ہونے پر میری طرف سے مبارک باد قبول کریں۔ وقار محسن کی "چاند گاڑی" اور ذیشان قریشی کی "چچا تیز گام شادی میں گئے" پڑھ کر ہنسی سے لوٹ پوٹ ہو گئے۔ نذیر انبالوی کی تحریر "ایک عدالت ایسی" پڑھ کر آنکھوں میں آنسو آگئے۔

(احسن ایاز، صوابی)

مئی کے شمارے میں کہانیاں چچا تیز گام شادی میں گئے ایک عدالت ایسی، اُمید بہار رکھ، گواہی اور سچ کی آواز عمدہ تھیں۔

(احسن التقویم، مینگورہ)

کیا ہم بلاعنوان کے ایک سے زیادہ عنوان بھیج سکتے ہیں؟

(محمد جعفر صادق، وہاڑی)

☆ آپ ایک سے زیادہ عنوان بھیج سکتے ہیں۔

تعلیم وتربیت کے تمام سلسلے بہت زبردست ہیں۔ ان میں سے کسی ایک کو خاص نہیں کہا جا سکتا بلکہ تمام سلسلے خاص ہیں۔

(نازیہ نذیر، مصطفےٰ آباد)

کہانیوں میں جنگل سے جنگل تک، بندگی، چچا تیز گام، سچ کی آواز اور امید رکھ بہت پسند آئیں۔ جب کہ معلوماتی تحریر کہانی کاغذ کی بہت پسند آئی۔ (محمد خالد، ڈیرا اسماعیل خان)

مئی کے شمارے میں کردار، فرض اور نفع کا سودا بہت سبق آموز کہانیاں تھیں۔ (اویس اصغر، لاہور)

اس مرتبہ تمام کہانیاں اچھی تھیں۔ درسِ قرآن وحدیث کا

سلسلہ بہت اچھا ہے۔ آؤ مسکرائیں میں لطائف مزے دار تھے۔ میں ایک کہانی بھیج رہی ہوں۔ اچھی ہوئی تو ضرور شائع کر دیں۔

(کائنات منظور، راول پنڈی)

تعلیم وتربیت کی 70 ویں سال گرہ مبارک ہو۔ شکر ہے چچا تیز گام پہنچ گئے۔ انہیں اپنے درمیان پا کر بہت خوشی ہوئی۔

(نور الرحمٰن، واہ کینٹ)

بچوں کا انسائیکلوپیڈیا ایک زبردست سلسلہ ہے جو بچوں کی معلومات بڑھانے میں اہم کردار ادا کر رہا ہے۔

(محسن صدیق، منڈی بہاؤالدین)

اس ماہ کا شمارہ دل کو بہت بھایا اور آخر کار چچا تیز گام کی بھی گاڑی پہنچ گئی۔ کہانیوں میں محسن، بندگی اور گواہی عمدہ تھیں۔ تعلیم وتربیت میں ہر طرح کی کہانی ہوتی ہے جس سے سب قارئین لطف اندوز ہوتے ہیں۔ میں نے اس سال آٹھویں جماعت میں اول پوزیشن حاصل کی ہے۔

(معزر یحان، اسلام آباد)

میں گذشتہ گیارہ سال سے تعلیم وتربیت پڑھ رہا ہوں لیکن شرکت پہلی دفعہ کر رہا ہوں۔ یہ میرا پسندیدہ رسالہ ہے، میں نے اس سے بہت کچھ سیکھا ہے۔ میرے پاس گیارہ سالوں کا ریکارڈ محفوظ ہے۔ جو رسالہ شائع ہوتا ہے میں اُسے پڑھ کر اپنے پاس محفوظ کر لیتا ہوں۔ میں جب بھی پرانے شمارے پڑھتا ہوں تو ایک نیا احساس پیدا ہوتا ہے اور کچھ سیکھنے کو ملتا ہے۔

(خماس بدر، اسلام آباد)

تعلیم وتربیت کا ہنستا مسکراتا شمارہ دیکھ کر دل باغ باغ ہو گیا۔ کہانیاں چچا تیز گام شادی میں گئے، اُمید بہار رکھ اور گواہی اپنی مثال آپ تھیں۔

(ملک محمد سفیر، فتح جھنگ)

مئی کا شمارہ ہمیشہ کی طرح لاجواب تھا۔ کہانیاں گواہی، بندگی اور سچ کی آواز عمدہ کہانیاں تھیں۔

(ماہم افتخار، پشاور)

مفید مشغلے میں میرا پسندیدہ مشغلہ کتابیں پڑھنا بھی شائع کریں۔

(وانیا خان، ہری پور ہزارہ)

☆ لیجئے ہم نے آپ کی فرمائش پوری کر دی ہے۔ اس مرتبہ سلسلہ مفید مشغلے کتب بینی کے حوالے سے ہے۔

مئی کے شمارے میں خوشبو سب کے لیے، سچ کی آواز، ایک عدالت ایسی اور چچا تیز گام شادی میں گئے عمدہ تحریریں تھیں۔

(دانیال ناصر، لاہور)

کہانی کاغذ کی، مفید مشغلے اور جنگل سے جنگل تک کہانیوں نے متاثر کیا۔ اس مرتبہ سرورق اچھا تھا۔

(شفق معراج، کراچی)

ان بچوں کے بھی خطوط موصول ہوئے

عمارہ الطاف راول پنڈی۔ معاذ بن مقصود واہ کینٹ۔ سیدہ نادیہ یاسمین کراچی۔ ارسہ شاہد لاہور۔ محمد یعقوب پشاور۔ وجیہہ زبیر کراچی۔ حبیب اللہ بلوچ پشاور۔ شہزاد عباس ملتان۔ مشہود حسین پشاور۔ ارسلان ارشد منگلا۔ علی شہزور فیصل آباد۔ معاذ احمد صدیقی کندیاں۔ خضر حیات، رانا سلیم احمد روڈا تھل۔ عاصم جاوید لاہو۔ محمد حیات عباس چکوال۔ طیبہ طفیل گوجرانوالہ۔ ردا چوہدری، محمد احمر چوہدری راول پنڈی۔ عزیز اللہ اٹک۔ محمد اسامہ خان بہاول پور۔ محمد اسد میاں والی۔ احمد سلمان ملک گوجرانوالہ۔ حسین نثار فیصل آباد۔ محمد شہباز اعوان ڈیرا غازی خان۔ قرۃ العین اوکاڑا۔ عبداللہ کوئٹہ۔ ظہیر بابر، تنویر بابر ساہی وال۔ شوکت سلطان، محمد عمر، جواد احمد، آزاد کشمیر۔

رمشاء اپنے لان میں بیٹھی تھی کہ اُس کے پاس رکھے موبائل فون کی بیل نے اُسے چونکا دیا۔ انسپکٹر خورشید کال کر رہے تھے۔ اُس نے فوراً موبائل اٹھا کر "ہیلو" کہا۔

"رمشاء مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے، کیا میں تمہارے پاس آ سکتا ہوں؟" انسپکٹر خورشید کی آواز ابھری۔

"بالکل انکل یہ آپ ہی کا گھر ہے، آپ فوراً چلے آئیں۔" رمشاء نے کہا۔

ٹھیک ایک گھنٹے بعد انسپکٹر خورشید رمشاء کے ساتھ بیٹھے چائے پی رہے تھے۔

"میرا خیال ہے کہ اب ہم کام کی بات کر لیں۔" انسپکٹر خورشید نے چائے کا آخری گھونٹ بھرتے ہوئے کہا۔

"بالکل، میں ہمہ تن گوش ہوں۔" رمشاء بولی۔

"میرا ایک دوست جیلر ہے۔ وہ کل میرے پاس آیا تھا اور اُس نے ایک عجیب و غریب کہانی مجھے سنائی۔ اُس کا کہنا ہے کہ ایک قیدی اُس کے لیے دردِ سر بن کر رہ گیا ہے۔"

"کیا قیدی جیل میں ہنگامہ کیے رکھتا ہے؟" رمشاء نے پوچھا۔

"ہرگز نہیں..... بلکہ بقول میرے دوست کے اُس نے اپنی پندرہ سالہ نوکری میں اتنا مظلوم اور شریف قیدی نہیں دیکھا۔"

"تو پھر کیا مسئلہ ہے؟" رمشاء کی دل چسپی بڑھتی جا رہی تھی۔

"وہ ہر مہینے کچھ گھنٹوں کے لیے اچانک غائب ہو جاتا ہے۔"

"کیا مطلب؟ وہ جیل سے غائب ہو جاتا ہے اور کوئی اس کو پکڑ نہیں سکتا پھر وہ دوبارہ آ بھی جاتا ہے..... یہ کیسا گورکھ دھندا ہے؟" رمشاء نے سوال پر سوال کرتی گئی۔

"یہی تو مشکل ہے..... وہ نہ صرف غائب ہو جاتا ہے بلکہ چوری اور ڈاکہ بھی ڈال آتا ہے..... لیکن حیرت کا مقام یہ ہے کہ وہ نظروں کے سامنے بھی موجود رہتا ہے....." انسپکٹر خورشید نے الجھے الجھے لہجے میں کہا۔

"اف..... میری سمجھ تو جواب دے رہی ہے..... آخر آپ کیا کہنا چاہتے ہیں....." رمشاء پریشان ہو کر بولی۔

"اب تم دھیان سے میری بات سنو..... اور اس مسئلے بلکہ پہیلی کو حل کرنے میں میری اور میرے دوست کی مدد کرو..... آج سے پانچ سال پہلے یہ قیدی جس کا نام منصور احمد ہے ایک ڈکیتی کے نتیجے میں قید ہو کر جیل آیا، لیکن وہ پہلے دن سے ایک ہی بات کہہ رہا ہے کہ وہ تو ایک پرائیویٹ ادارے میں کلرک ہے۔ اِس کا کسی ڈکیتی سے دُور دُور کا بھی تعلق نہیں ہے..... جیل میں آ کر وہ کئی دن تک صدمے کی کیفیت میں رہا اور آخر کار جب کسی نے اُس کی رہائی کے لیے کوشش نہ کی تو وہ ایک دم خاموش ہو کر رہ گیا۔ ایسا لگتا تھا جیسے اُس نے دُنیا ترک کر دی ہو۔ وہ ہر چیز سے لاتعلق سا ہو کر رہ گیا۔ پھر چھ مہینے سے عجیب و غریب واقعات کا سلسلہ

شروع ہو گیا۔ شہر میں ہر مہینے ایسی ایک آدھ ڈکیتی ضرور ہونے لگی جس میں گواہوں کے اور خفیہ کیمروں کے مطابق جو شخص اس ڈکیتی کا سرغنہ ہے اُس کا حلیہ بالکل منصور سے ملتا ہے۔ پہلے میرے دوست کو یہ لوگوں کا وہم لگا کیوں کہ جیل کی اُونچی اور مضبوط دیواریں پھاندنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ جیل کی دیواروں کے اُوپر بھی جو خاردار تاریں لگی ہوئی ہیں اُن میں رات 9 بجے کے بعد کرنٹ چھوڑ دیا جاتا ہے اور یہ وارداتیں رات گیارہ بجے سے بارہ بجے کے درمیان ہوئی ہیں۔ جب تھانے میں خفیہ کیمروں کی فلمیں دیکھی گئیں تو ریکارڈ میں موجود منصور کا حلیہ بالکل ان ڈاکوؤں کے گروہ کے سرغنہ جیسا تھا۔ پولیس نے جیل سے رابطہ کیا تو میرے دوست زاہد نے اس بات کو ماننے سے انکار کر دیا کہ یہ ممکن ہی نہیں کیونکہ ایک تو وہ اپنے سکیورٹی سسٹم سے بہت مطمئن تھا دُوسرے یہ کہ منصور تو پہلے ہی دُنیا ترک کر چکا تھا اور ایک کونے میں بیٹھا خلا میں گھورتا رہتا ہے شاید وہ اپنی رہائی کے دن گنتا رہتا ہے، بھلا ایسا انسان کیا ڈاکے ڈالے گا۔" اتنا کہہ کہ انسپکٹر خورشید خاموش ہو گئے۔

"آپ نے بالکل صحیح کہا لیکن آخر پھر آپ میری مدد کیوں مانگنے آئے ہیں۔ معاملہ تو صاف ہے کہ وہ قیدی نہ تو جیل سے باہر جا سکتا ہے اور نہ اُسے ایسی کوئی خواہش ہے۔" رمشاء نے سوچتے ہوئے کہا۔

"یہیں تو معاملہ ٹیڑھا ہو گیا ہے دراصل چار مہینے پہلے منصور کے سامان سے ڈکیتی میں لوٹے جانے والی اشیاء کا کچھ حصہ ملنا شروع ہو گیا جیسے اگر سنار کی دُکان سے چوری ہوئی تو ایک آدھ انگوٹھی اُس کے سامان سے برآمد ہو گئی، کہیں رقم لوٹی گئی تو اُس کا کچھ حصہ اس کے کپڑوں کی گٹھڑی میں سے مل گیا اور یوں یہ سلسلہ پچھلے چار مہینوں سے جاری ہے۔" انسپکٹر خورشید نے ایک گہرا سانس لے کر بات ختم کی۔

"اووووو!!!!" رمشاء نے سیٹی بجانے والے انداز سے ہونٹوں کو گول کرتے ہوئے حیرت سے آواز نکالی۔

"اب بتاؤ تم کیا کہتی ہو؟" انسپکٹر خورشید ٹانگ پر ٹانگ رکھتے ہوئے بولے۔

"کیا آپ نے منصور قیدی سے اس کے بارے میں پوچھ گچھ کی ہے؟" رمشاء نے پوچھا۔

"ظاہر ہے..... پورا پولیس ڈیپارٹمنٹ اس سے مسلسل پوچھ گچھ میں مصروف ہے لیکن اس کے پاس صرف آنسوؤں کے اور کچھ نہیں ہے۔ پہلے تو وہ صحتِ جرم سے انکار کرتا رہا لیکن آخر اُس نے پھر خاموشی کی ڈھال میں پناہ لے لی ہے..... وہ پولیس کے "ڈرائنگ روم" کی بھی سیر کر چکا ہے..... لیکن اپنی زبان نہیں کھولتا ہے..... لیکن آخر سوال یہ اٹھتا ہے کہ وہ سب کی نظروں کے سامنے رہ کر باہر چوری کر کے کیسے واپس آجاتا ہے۔" انسپکٹر خورشید گھمبیر لہجے میں بولے۔

"واقعی معاملہ ٹیڑھا ہو گیا ہے..... کیا آپ سب کو یقین ہے کہ منصور ہی ڈکیتیوں میں ملوث ہے؟"

"سو فیصد..... اگر تم چاہو تو منصور سے مل سکتی ہو اور پھر وہ فلمیں بھی دیکھ لینا جو خفیہ کیمروں سے لی گئی ہیں۔"

"ایسا تو نہیں کہ....." رمشاء کچھ پوچھنے لگی پھر رک گئی۔

"میرا خیال ہے پہلے منصور سے مل لیا جائے باقی سوالات اور خدشات بعد میں ظاہر کیے جائیں تو بہتر ہے۔ میرا خیال ہے میں امی سے اجازت لے آؤں پھر ہم چلتے ہیں۔" رمشاء یہ کہہ کر تیزی سے اٹھی اور امی کے کمرے کی طرف بڑھ ہو گئی۔

کچھ دیر بعد وہ انسپکٹر خورشید کی جیپ میں سوار ہو کر جیل کی طرف رواں دواں تھی۔

منصور احمد واقعی ایک نہایت شریف اور سادہ لوح شخص لگتا تھا۔ اُس نے نظر اٹھا کر رمشاء اور انسپکٹر خورشید کی طرف دیکھا تک نہیں، وہ جب سے کمرے میں اُن کے سامنے پیش ہوا تھا تب سے چھت کو گھورے جا رہا تھا..... جیسے اُسے اپنے اِردگرد ہونے والے واقعات سے کچھ غرض ہی نہ ہو۔ کمرے میں گہری خاموشی تھی۔ آخر رمشاء نے پہل کی اور بولی۔

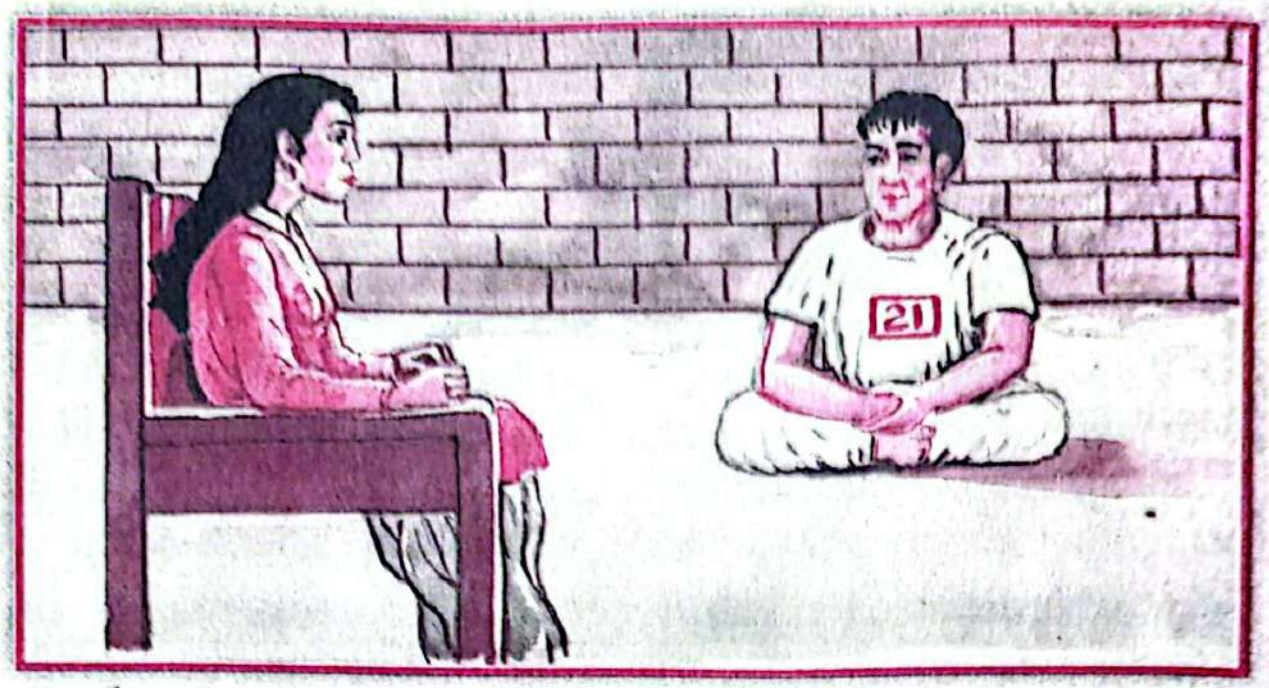

''منصور صاحب..... میں رمشاء ہوں، لوگ مجھے رمشاء 007 کے نام سے جانتے ہیں۔''

اتنا سننا تھا کہ منصور کی حالت میں حیرت انگیز انقلاب رونما ہوا وہ یک دم سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ اُس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔

''آ..... آپ..... واقعی رمشاء 007 ہیں۔ آپ وہی ہیں جن کا ذکر اخباروں میں آتا رہتا ہے اور آپ با آسانی مجرموں کو پکڑوا دیتی ہیں..... لیکن کیا آپ مجھ مظلوم کی مدد کرنے آئی ہیں یا مجرم سمجھ کر پوچھ گچھ کرنے آئی ہیں؟'' وہ پہلے پہل جوشیلے انداز میں بولا پھر آہستہ آہستہ اُس کی باتوں سے مایوسی جھلکنے لگی۔

''میں آپ کی مدد کرنے آئی ہوں..... میں نہیں سمجھتی کہ آپ جیسا سیدھا سادہ انسان آج تو کیا آج سے پانچ سال پہلے بھی کوئی جرم کر سکتا ہے..... اگر آپ نے میرے بارے میں سن رکھا ہے تو آپ یہ بھی جانتے ہوں گے کہ میں امیر و غریب کا امتیاز کیے بغیر مجرم کو بے نقاب کرتی ہوں..... اور میرا تجربہ یہ کہتا ہے کہ آپ واقعی بے قصور ہیں۔''

رمشاء کی باتیں سن کر منصور کی آنکھیں جھلملانے لگیں اور وہ بولنے لگا۔

''میں نہیں جانتا کہ تقدیر میرے خلاف کیوں ہے..... میں تو ایک ذمہ دار شہری کی طرح پُرسکون زندگی بسر کرنا چاہتا تھا کہ اچانک پولیس نے میرے گھر پر چھاپہ مارا..... اور مجھے پکڑ کر جانے کون کون سی ڈکیتی میرے سر پر لاد دی..... میں بہت رویا پیٹا لیکن کسی نے میری ایک نہ سنی۔ میرا اس دُنیا میں کوئی نہیں ہے..... چند دوست تھے لیکن وہ بھی اس مصیبت میں ساتھ چھوڑ گئے..... میں نے بھی یہ سب کچھ قسمت کا لکھا سمجھ کر قبول کر لیا لیکن لگتا ہے کہ قدرت کو ابھی میرے اور امتحان لینے تھے..... اب مجھ پر پھر دوبارہ ایسی ڈکیتیوں کا الزام لگایا جا رہا ہے جس کا ارتکاب کرنے کے لیے یا تو مجھے زیرِ زمین سرنگ کھود کر باہر نکلنا چاہیے تھا اور یا کہیں سے سلیمانی ٹوپی کا بندوبست کرنا چاہیے تھا تبھی یہ بات ممکن نظر آتی ہے کہ میں ایک ہی وقت میں جیل میں بھی رہوں اور باہر ڈکیتیاں بھی کرتا پھروں.....'' وہ اتنا کہہ کر بے اختیار رو پڑا۔

رمشاء نے اُسے خاموش کروانے کی کوشش بھی نہیں کی۔ وہ بھی یہ چاہتی تھی کہ اس آدمی کے دل میں جو برسوں کا غصہ اور غبار ہے وہ آنسوؤں کی شکل میں باہر نکل جائے۔

پندرہ منٹ تک منصور نارمل ہو چکا تھا۔ اب رمشاء نے تفتیش کو آگے بڑھانے کے لیے سوالات کا سلسلہ پھر سے شروع کیا۔

"لیکن منصور صاحب یہ تو بتایئے کہ آپ کے سامان میں ڈکیتی میں لوٹی ہوئی اشیاء کیوں ملی ہیں؟"

"آپ یقین کریں..... میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ یہ معمہ میری سمجھ سے باہر ہے۔ مجھے جیل میں بھی سکون نصیب نہیں ہے۔ اس سوال کے بارے میں سوچ سوچ کر میرا دماغ ماؤف ہونے لگتا ہے..... آپ یقین کریں کہ اب تو مجھے اپنے سامان کو ہاتھ لگاتے ہوئے بھی وحشت ہوتی کہ کہیں پھر کوئی نئی چیز برآمد نہ ہو جائے۔" منصور کے لہجے میں اتنی معصومیت تھی کہ انسپکٹر خورشید کو بھی اس پر یقین آنے لگا۔

"ٹھیک ہے اب آپ جا سکتے ہیں۔ لیکن اگر مجھے دوبارہ آپ کی مدد کی ضرورت ہوئی تو مجھے اُمید ہے کہ آپ تعاون کریں گے۔" رمشاء نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"کیوں نہیں..... کیوں نہیں۔" یہ کہتے ہوئے منصور اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اب اس کے چہرے پر تفکر نہیں بلکہ گہرا سکون تھا۔

"انکل! میری ملاقات آپ اپنے دوست زاہد سے بھی کروا دیجئے۔ میرا خیال ہے کہ اب ہم بہتر طریقے سے تفتیش کر سکتے ہیں۔" رمشاء نے کہا۔

"کیوں نہیں..... ابھی ملوائے دیتا ہوں۔" انسپکٹر خورشید نے یہ کہتے ہوئے اپنے ماتحت کو اشارہ کیا۔

کچھ دیر بعد جیلر زاہد ان کے درمیان موجود تھا۔

"زاہد صاحب! مجھے یہ بتایئے کہ اس قیدی کی کوٹھڑی میں کتنے قیدی ہیں اور کوٹھڑی کی صفائی کی ذمہ داری کس کے سپرد ہے؟" رمشاء نے اپنی چھوٹی سی نوٹ بک نکالتے ہوئے جیلر صاحب سے سوالات کا آغاز کیا۔

"اس کوٹھڑی میں پانچ قیدی اور ہیں..... اور جہاں تک صفائی کی ذمہ داری ہے تو یہ ڈیوٹی تبدیل ہوتی رہتی ہے۔" جیلر نے یقین سے کہا۔

"کیا آپ ذہن پر زور دے کر بتا سکتے ہیں کہ کس صفائی کرنے والے آدمی نے منصور کے سامان میں سے مسروقہ اشیاء برآمد کی تھیں۔" رمشاء تفصیلات کو نوٹ کرتے ہوئے بولی۔

"ایک بار احمد نے اور دُوسری دفعہ سہیل نے۔"

"آپ نے تو دو آدمیوں کے نام لیے ہیں..... جب کہ اشیاء چار دفعہ برآمد ہوئی ہیں۔"

"دراصل دونوں کی ڈیوٹی آپس میں بدلتی رہتی ہے..... ایک تیسرا قیدی بھی یہ فرائض انجام دیتا تھا لیکن وہ کچھ عرصے سے بیمار ہے..... پھر ان دونوں نے کہا کہ تیسرے آدمی کی کیا ضرورت ہے ہم یہ فریضہ آرام سے انجام دے سکتے ہیں۔" جیلر صاحب نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

"کیا میں ان دونوں حضرات کی فردِ جرم معلوم کر سکتی ہوں؟"

"ایک اغواء برائے تاوان کے کیس میں سزا بھگت رہا ہے جب کہ دُوسرا ڈکیتی کی واردات میں ملوث رہا ہے۔"

"کیا میں ان دونوں سے ملاقات کر سکتی ہوں؟"

"کیوں نہیں، ابھی انتظام ہو جاتا ہے۔"

کچھ دیر بعد رمشاء ان دونوں قیدیوں سے پوچھ گچھ میں مصروف تھی۔ آخر کار آدھے گھنٹے بعد اُس نے اپنی نوٹ بک بند کر کے جیب میں رکھ لی..... اُس کے چہرے پر قدرے اطمینان تھا۔ اُس نے دونوں کو رخصت کر دیا۔

"جیلر صاحب..... مجھے اِس سلسلے میں آپ کا خصوصی تعاون درکار ہو گا..... اور اِس کے لیے مجھے آپ کے چند سپاہیوں کی مدد چاہیے..... کیا آپ تیار ہیں؟" رمشاء نے کہا۔

"کیوں نہیں..... میں تو ذاتی طور پر اس عجیب و غریب معمے کو حل کرنا چاہتا ہوں لیکن یہ معاملہ سب کی سمجھ سے باہر ہے..... ظاہر ہے کوئی انسان دھواں بن کر تو ہوا میں تحلیل نہیں ہو سکتا کہ باہر وہ غیر قانونی سرگرمیوں میں بھی ملوث رہے اور جیل میں بھی موجود رہے..... اگر آپ کی ذہانت اس گتھی کو سلجھا سکے تو ہمیں اور کیا چاہیے۔" جیلر صاحب نے تعاون کا پورا یقین دلاتے ہوئے کہا۔

"بہت شکریہ..... تو ایسا کرتے ہیں ہم ابھی سے ابتداء کرتے ہیں..... آپ کا ریکارڈ روم کہاں ہے؟" رمشاء نے اٹھتے ہوئے کہا اور پھر سب لوگ ریکارڈ روم کی طرف چل پڑے۔

----☆☆----

.....رات کے 2 بج رہے تھے۔

رمشاء کے سرہانے رکھا فون بجنا شروع ہو گیا..... رمشاء نے آنکھیں ملتے ہوئے فون اٹھایا..... دُوسری طرف کی گفتگو سنتے سنتے نیند اس کی آنکھوں سے غائب ہو گئی..... وہ انتہائی ساکت وجامد انداز سے فون کرنے والے شخص کی بات سن رہی تھی۔

"کیا آپ اس وقت اپنے چار سپاہی میرے پاس بھیج سکتے ہیں؟" رمشاء بولی۔

دُوسری طرف سے جواب اثبات میں دیا گیا۔

ایک شخص رات کی تاریکی میں نہایت احتیاط سے قدم اٹھاتے ہوئے کچی بستی کی طرف بڑھ رہا تھا کہ اچانک ایک تیز رفتار جیپ اس کے پاس آ کر رکی اور اس میں سے چار سپاہی بر آمد ہوئے..... اس سے پہلے کہ وہ راہ گیر کچھ سمجھ پاتا، اس کے اُوپر تیزی سے کمبل ڈال دیا گیا اور اُسے اٹھا کر جیپ میں ڈال دیا گیا..... اب جیپ تھانے کی طرف روانہ ہو رہی تھی۔

رمشاء کے فون کرنے پر جیلر صاحب اور انسپکٹر خورشید صبح کے چار بجے جیل کے دفتر میں موجود تھے۔ اُن کے سامنے ایک آدمی کمبل میں لپٹا ہوا بیٹھا تھا۔ اُس کا چہرہ ابھی تک ڈھکا ہوا تھا۔ اُسے رسیوں سے باندھ دیا گیا تھا۔

"یہ کون ہے؟" انسپکٹر خورشید اور جیلر صاحب نے ایک ساتھ دریافت کیا۔

"یہ آپ کا مجرم ہے....." رمشاء نے اطمینان سے کرسی پر پہلو بدلتے ہوئے کہا۔

"کک کیا..... مطلب..... یہ ہے کون؟"

"منصور"

"کیا؟؟؟" انسپکٹر خورشید کے منہ سے چیخ نکل گئی۔

"اس سے پہلے کہ اِس کی رونمائی کی جائے..... میں آپ کو ایک کہانی سنانا چاہتی ہوں..... منصور احمد ایک سیدھا سادہ بندہ تھا..... لالچ اور حرص اُسے چھو کر بھی نہیں گیا تھا..... ایک روز وہ اپنے گھر آیا تو اُس کو اپنے گھر میں بے ترتیبی سی محسوس ہوئی..... چونکہ وہ گھر میں رہنے والا واحد فرد تھا اس لیے ہر چیز اُس کے اپنے ہاتھوں سے رکھی ہوئی تھی، اس لیے اسے فوراً پتہ چل گیا کہ اس کی غیر موجودگی میں کوئی شخص اس کے گھر میں گھسا ہے..... لیکن تالا جوں کا توں لگا ہوا تھا۔ اور حیرت کی بات یہ تھی کہ گھر سے کسی قسم کی کوئی چیز بھی غائب نہیں ہوئی تھی..... اُس نے صبح آس پاس کے لوگوں سے پوچھا بھی تو سب نے یہی کہا کہ انہوں نے منصور کے علاوہ کسی کو گھر میں آتے جاتے نہیں دیکھا چونکہ کوئی نقصان نہیں ہوا تھا اس لیے منصور نے بھی چپ سادھ لی..... کچھ عرصے بعد کوئی شخص منصور کی ہر نقل وحرکت پر نظر رکھنا شروع ہو گیا..... یہ نگرانی نہایت غیر محسوس طریقے سے ہو رہی تھی کہ اچانک ایک دن پولیس نے اُس کے گھر پر چھاپہ مار کر اُسے گرفتار کر لیا۔

اب یہ کہانی تو تقریباً یہاں ختم ہو جاتی ہے لیکن اسی کہانی کا ایک سرا ایک ایسی کہانی سے ملتا ہے جو حقیقت سے دُور نظر آتی ہے لیکن قدرت کے کھیل نرالے ہوتے ہیں..... ہم اسے اور اس کی طاقت کو سمجھ نہیں سکتے۔

ہاں تو دُوسری کہانی یہ تھی کہ ایک شخص انتہائی لالچی اور خود غرض تھا، اُسے دولت کمانے کا جنون تھا لیکن چونکہ وہ ایک شریف ماں باپ کی اولاد تھا اس لیے کھلم کھلا غیر قانونی سرگرمیوں میں مبتلا نہیں ہو سکتا تھا..... اس کے والدین غریب تھے اور کچی بستی میں رہتے تھے لیکن محلے میں اُن کی شرافت کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی..... ایک دن وہ لالچی شخص ایک دوست کی شادی میں گیا..... وہاں اس نے دُور سے ایک ایسے شخص کو دیکھا جو دلہن والوں کا جاننے والا تھا اور خاصا

الگ تھلگ ایک کونے میں بیٹھا تھا۔ اُسے دیکھتے ہی اُس شخص کو اپنے خواب سچ ہوتے محسوس ہونے لگے..... وہ لالچی شخص اس سیدھے سادھے آدمی کا پیچھا کرتے ہوئے اُس کے گھر تک پہنچ گیا اور کئی دن اُس کی نقل و حرکت پر نظر رکھی۔ وہ چونکہ ایک بے ضرر انسان کے تعاقب میں تھا اس لیے کسی نے اس پر توجہ بھی نہیں دی..... اب ایک روز آدھی رات کو اس لالچی شخص نے ایک جیولر کی دُکان پر ڈاکہ ڈالا اور خود خفیہ کیمرے کے سامنے اپنا چہرہ بھی دکھاتا رہا..... اس ڈکیتی سے فارغ ہو کر اُس نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ پولیس کو اس سیدھے سادھے آدمی کے بارے میں یہ اطلاع فون پر دی کہ یہ ڈکیتی اُس آدمی نے کی ہے۔

اب قدرت کے اس کھیل کو کیا نام دیں کہ وہ شخص انیس بیس کے فرق سے بالکل دُوسرے آدمی کے مشابہہ تھا..... اور یوں وہ معصوم آدمی پولیس کے ہتھے چڑھ گیا۔" اتنا کہہ کر رمشاء خاموش ہو گئی۔

"بہت دل چسپ کہانی ہے۔" انسپکٹر خورشید نے کہا۔

"اس ڈکیتی کے بعد وہ لالچی شخص کچھ عرصہ روپوش رہا پھر اس نے منشیات کا خفیہ کاروبار شروع کیا..... اور ظاہر ہے کہ برے لوگوں سے ہی اس کا واسطہ رہا..... سو اس کے حلقۂ احباب میں بدمعاش ٹائپ کے لوگ شامل ہو گئے..... اب مصیبت یہ تھی کہ منشیات کا کاروبار خطرے کا کاروبار تھا..... اس میں کسی بھی وقت پولیس کا سامنا ہو سکتا تھا..... اس لیے اس لالچی شخص نے ایک بار پھر ڈکیتی کا فیصلہ کیا..... اُس کے منہ کو تو حرام لگ ہی چکا تھا۔ وہ اپنے ماں باپ سے علیحدہ ہو کر اسی شہر میں مقیم تھا اور ان پر یہ ظاہر کرتا تھا کہ وہ دُوسرے شہر میں ملازمت کرتا ہے..... کیوں کہ اس کے امیرانہ ٹھاٹ اس کے شریف ماں باپ کو ہزاروں سوالات پوچھنے پر مجبور کرتے تھے، جس کا اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا..... وہ ہر مہینے جا کر اُن کو بستی میں مل آتا تھا۔

ہاں تو ہم بات کر رہے تھے دُوسری ڈکیتی کی..... اس شخص نے اپنے ہم شکل نوجوان کو ایک بار پھر پھنسانے کا منصوبہ بنایا، اس بار اس نے اپنے اثر و رسوخ سے جیل میں موجود دو قیدیوں کو اپنا ہم نوا بنایا اور ان کو ڈکیتی میں سے ایک چوتھائی حصہ دینے کا وعدہ کر لیا۔ وہ دونوں قیدی فوراً راضی ہو گئے..... اُنہیں کام بھی بہت معمولی کرنا تھا کہ کچھ سامان اس شریف قیدی کے سامان میں ہر مہینے شامل کر دینا ہوتا تھا..... میں نے سپاہیوں سے ان دونوں قیدیوں کی نگرانی کروائی اور معاملہ صاف ہو گیا۔"

"اوہ..... یہ بات تھی!" جیلر صاحب غصے سے بولے۔

"لیکن تم تو کہہ رہی تھیں کہ ہمارے سامنے منصور بیٹھا ہے۔" انسپکٹر خورشید بول اٹھے۔

"جی ہاں..... آپ کو یقین نہ آئے تو دیکھ لیں۔" رمشاء نے اس مشکوک آدمی کے چہرے سے کمبل ہٹاتے ہوئے کہا۔

اُس کی شکل دیکھ کر انسپکٹر اور جیلر صاحب دونوں حیران رہ گئے۔ وہ منصور ہی لگتا تھا۔

"قدرت کا کھیل یہ بھی تھا کہ یہ شخص منصور کا صرف ہم شکل ہی نہیں تھا ہم نام بھی تھا..... اور قسمت کی اس ستم ظریفی سے اس مکروہ شخص نے بھرپور فائدہ اٹھایا..... آج یہ وعدے کے مطابق جیل کی پچھلی دیوار سے سامان کی پوٹلی اندر پھینک کر گیا ہے جو اس وقت آپ کے سپاہیوں کے قبضے میں ہے..... احمد اور سہیل تو کب کے پکڑے جا چکے ہیں۔ اور اس وقت کال کوٹھڑی میں بند ہیں..... ہم نے اس شخص کا تعاقب کیا اور اب سب کچھ آپ کے سامنے ہے۔" رمشاء نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا۔

"تم نے تو کمال کر دیا....." جیلر صاحب کھل اٹھے۔

"لیکن آپ مجھے بتائیے کہ کیا آپ منصور احمد کے وہ سنہری پانچ سال واپس دلا سکتے ہیں جو جیل کی سلاخوں کے پیچھے گزر گئے۔" یہ کہتے ہوئے رمشاء کی آنکھوں میں آنسو تیر گئے۔

اس سوال کا جواب کسی کے پاس بھی نہیں تھا۔

---☆☆---

دوست ہو تو ایسا۔۔۔!

نذیر انبالوی (لاہور)

لکشمی چوک میں واقع ماشاء اللہ کڑاہی ہاؤس میں نوجوانوں کی ایک ٹولی کو اپنے چھٹے دوست کا شدت سے انتظار تھا۔ سب خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ ہنسی مذاق ہو رہا تھا، قہقہے لگائے جا رہے تھے۔ کڑاہی ہاؤس کے اندر اور باہر خاصا رش تھا۔ سلاخوں پر لٹکتے ہوئے ذبح بکروں اور برائلر کو گاہک کھا جانے والی نظروں سے گھور رہے تھے۔ رات کے وقت وہاں کی رونق دیکھ کر یوں لگ رہا تھا کہ شاید دن کا آغاز ہوا ہے۔ ویٹر تیزی سے گاہکوں کے آرڈرز ایک چھوٹی سی کاپی پر نوٹ کرتے جا رہے تھے۔ جو گاہک اپنے آرڈر لکھوا دیتے وہ یا تو کونے میں لگے ٹیلی ویژن پر کسی مقبول عام فلمی گیت سے دل بہلانے لگتے یا نوجوانوں کی ٹولی کی طرح بات بات پر قہقہے بکھیرنے لگتے اور کچھ ایسے بھی تھے جو سیاست پر گفتگو کر کے کڑاہی کے آنے کا انتظار کر رہے تھے۔ کاؤنٹر پر موجود مالک اپنے ملازمین پر کڑی نظر رکھے ہوئے تھا۔ اِدھر کسی ملازم نے ذرا سی کوتاہی کی اُدھر مالک کی آواز اُس کے کانوں میں پڑی۔

"ٹھیک طریقے سے کام کرو۔"

ویٹر اپنی کاپی لئے جب بھی نوجوانوں کی ٹولی کے پاس آتا اُسے ایک ہی جواب ملتا کہ انتظار کرو ہمارا چھٹا دوست آنے ہی والا ہے۔ جب دیوار پر لگی گھڑی نے نو بجے کا اعلان کیا تو جبار نے آفتاب سے پوچھا۔

"تم نے پہلوان جی کو اطلاع دی بھی تھی یا نہیں؟"

"میں نے خود پہلوان جی کو فون کیا تھا..... میں نے کہا تھا کہ آٹھ بجے ماشاء اللہ کڑاہی ہاؤس پہنچ جانا۔" آفتاب بولا۔

"یار کہیں پہلوان بھول نہ گیا ہو۔" قمر کی اِس بات پر چاروں نے ایک زور دار قہقہہ لگایا۔

"اوئے قمر کہہ رہا ہے پہلوان جی بھول نہ گیا ہو..... ہے نا بے وقوفوں والی بات۔"

ریاض نے مسکراتے ہوئے قمر کو دیکھا۔

"بات تو تم ٹھیک کہتے ہو..... مٹن کڑاہی کی دعوت ہو اور پہلوان بھول جائے اُس نے تو تبھی سے کھانا پینا بند کر دیا ہو گا جب سے اُسے دعوت کا پتہ چلا ہو گا۔ اسے تو شاید خواب میں بھی گوشت ہی دکھائی دیتا ہے۔ پہلوان اتنا گوشت کھاتا ہے کہ

بس توبہ..... توبہ۔" شہزاد نے اپنے کانوں کو ہاتھ لگائے۔

وہ انہی باتوں میں مصروف تھے کہ سامنے کے دروازے سے ایک بھاری بھر کم نوجوان اندر داخل ہوا تو نوجوانوں کی ٹولی نے اُسے دیکھ کر نعرہ بلند کیا۔

"پہلوان جی کی سواری آئی ہے..... گوشت کی شامت آئی ہے۔" پہلوان جی نے دونوں ہاتھ بلند کر کے نعرے کا جواب دیتے ہوئے کہا۔

"اب میں آگیا ہوں..... ایک ایک بکرے کو دیکھ لوں گا۔"

"اتنی دیر سے کیوں آئے ہو؟" ریاض نے سوال کیا۔

"وہ یار میرا سکوٹر نہیں ہے۔"

"وہی جو تمہارا سات من کا وزن اٹھائے اٹھائے پھرتا ہے..... بڑی ہمت ہے بیچارے کی....." جبار نے پہلوان جی کی بات درمیان سے اچک لی۔

"بات تو پوری کرنے دیا کرو..... یار سکوٹر پنکچر ہو گیا تھا۔" پہلوان جی کی بات سن کر شہزاد نے فوراً کہا۔

"بیچارے نے پنکچر ہی ہونا تھا، آخر کب تک تمہارا بوجھ برداشت کرتا۔"

"تم اپنی زبان بند رکھو..... کھاتے پیتے لوگ ہیں..... کھاتے ہیں اور جان بناتے ہیں، تمہاری طرح تیلا پہلوان نہیں ہیں۔ نہ پتہ چلتا ہے کہ کپڑے تم نے پہن رکھے ہیں یا کپڑوں نے تمہیں پہن رکھا ہے، کھایا پیا کرو..... جان ہے تو جہان ہے....." پہلوان جی کی تقریر جاری تھی کہ ویٹر پھر آن دھمکا۔

"بس جی اب تو آرڈر لکھوا دیں۔"

"ہاں لکھو..... دو کلو مٹن کڑاہی۔"

"بس دو کلو..... دو کلو کڑاہی تو اکیلا پہلوان ہی کھا جائے گا ہم کہاں جائیں گے؟"

ریاض نے خدشہ ظاہر کیا۔

"چلو تین کلو کر لو۔"

"نہیں ساڑھے تین کلو لکھو۔"

"نہیں چار کلو کر لو۔"

ویٹر نے انہیں ناخوش گوار انداز میں گھورا۔

"آپ پہلے فیصلہ کر لیں میں پھر آجاتا ہوں۔"

"بس جی فیصلہ ہو گیا۔ تین کلو مٹن کڑاہی لے آؤ۔ نان گرم..... پانی ٹھنڈا اور سلاد تازہ ہونا چاہیے۔" جبار بولتا چلا گیا۔ کڑاہی کے آنے تک دوستوں میں جملوں کا تبادلہ ہوتا رہا۔ جب کڑاہی اُن کے سامنے دھری گئی تو سبھی خاموشی کے ساتھ اُس پر ٹوٹ پڑے۔ پہلوان جی نے کڑاہی پر خوب ہاتھ صاف کیا۔ جب کڑاہی ختم ہو گئی تو پہلوان جی نے ڈکار لیتے ہوئے کہا۔

"یار قمر! اللہ تمہارے کاروبار میں برکت ڈالے..... تم نے اتنی مزے دار کڑاہی کھلائی ہے کہ ایمان سے مزا آگیا ہے..... اللہ تمہیں خوش رکھے۔"

پھر سب ہنستے کھیلتے اپنے اپنے گھروں کی طرف روانہ ہو گئے۔ چھ دوستوں کا یہ گروپ سکول کے زمانے میں بنا تھا۔ ان کا دھیان پڑھائی سے زیادہ شرارتوں کی طرف ہوتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ان میں سوائے شہزاد کے میٹرک سے آگے کوئی نہ پڑھ سکا تھا۔ قمر، جبار اور پہلوان جی (جس کا اصل نام توقیر تھا۔ موٹا ہونے کی وجہ سے سبھی اسے پہلوان جی کے نام سے پکارتے تھے) اپنا ذاتی کاروبار کرتے تھے جب کہ ریاض، آفتاب اور شہزاد ملازمت کرتے تھے۔ سب کا آپس میں ہر وقت رابطہ رہتا۔ خوشی کے موقع پر اُن کی اکثر دعوتیں ماشاء اللہ کڑاہی ہاؤس میں ہوتی تھیں۔ قمر نے کچھ عرصہ پہلے ہی لٹن روڈ پر موٹر سائیکل سپیئر پارٹس کے کاروبار کا آغاز کیا تھا۔ کاروبار شروع کرنے کے سلسلہ میں اُس نے اپنے دوستوں کو دعوت دی تھی۔

ان سب کا اس کڑاہی ہاؤس میں آنے کی بڑی وجہ پہلوان تھا۔ اُس کا کہنا تھا کہ اس جیسی کڑاہی تو پورے ملک میں کہیں نہیں ملتی۔ پہلوان جی کی گوشت خوری کے ایسے ایسے قصے مشہور تھے کہ سننے والے یقین ہی نہ کرتے تھے۔ ایک دفعہ پہلوان جی کو ایک بارات کے ساتھ سرگودھا جانا پڑ گیا۔ راستے بھر مزے دار گوشت کے سہانے خواب دیکھنے کے بعد پہلوان جی بارات کے ہمراہ سرگودھا پہنچا تو نکاح کے بعد باراتیوں کو ایک دری پر بٹھا کر چھوٹے چھوٹے پیالوں میں ایک بوٹی، دو آلو اور تھوڑا سا شوربہ ڈال کر تقسیم کا عمل شروع ہوا۔ پہلوان جی

نے بوٹی کھائی اور ایک شخص کی طرف پیالہ بڑھایا۔ "اور لاؤ۔"

چند لمحوں بعد ایک اور بوٹی پہلوان جی کے سامنے موجود تھی۔ اتنے سے گوشت سے پہلوان جی کا کیا بنتا۔ جب چوتھی بار پیالہ ایک شخص کی طرف بڑھایا تو وہ بولا۔

"آلو بھی اللہ نے کھانے کے لیے بنائے ہیں۔"

"گوشت ہو تو آلو کون کافر کھاتا ہے، گوشت ویسے ہے مزے دار، ابھی تو میں نے گوشت کھانا شروع کیا ہے۔"

یہ سن کر وہ شخص خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا۔ پہلوان نے گوشت خوری کا عمل جاری رکھا۔ لانے والے تھک گئے مگر گوشت کھاتے کھاتے پہلوان نہ تھکا، وہ ایک ایک بوٹی کر کے بیس بائیس بوٹیاں کھا چکا تھا۔ اُس کے آس پاس بیٹھے باراتی کھاپی کر اٹھ گئے تھے مگر وہ ابھی تک گوشت کے محاذ پر ڈٹا ہوا تھا۔ لڑکی والوں کی گوشت کی دیگوں پر اس کے حملے جاری تھے کہ ایک بزرگ نے کہا۔

"بیٹا! اب بس بھی کرو۔" یہ سن کر وہ سمجھ گیا کہ مخالف فوج نے ہتھیار ڈال دیئے ہیں۔ اب اس کے پاس وہاں سے اٹھنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ جب حکومت نے شادی کے موقعہ پر کھانے پر پابندی لگائی تو اِس کا سب سے زیادہ صدمہ پہلوان جی کو ہوا تھا۔ گوشت کھانے کا ایک نادر موقعہ اس کے ہاتھ سے نکل گیا تھا۔ اب اُس کی زبان پر ایک ہی بات ہوتی تھی۔

"بارات میں جانے کا مزا ہی نہیں رہا..... اُس بارات میں جانے کا کیا فائدہ جہاں گوشت نہ ہو۔"

دوست اُس کا مذاق اڑاتے کہ حکومت نے کھانے پر پابندی بھی تمہاری وجہ سے لگائی ہے۔ پہلوان جی کے گھر میں جس دن گوشت نہ پکتا اُس کا موڈ خراب ہو جاتا۔ شہر میں کس کس قصائی کے ہاں اچھا گوشت ملتا ہے اس کی مکمل تفصیل پہلوان کے پاس موجود ہوتی تھی۔ اس کے گھر میں کبھی گوال منڈی سے گوشت آتا تو کبھی اچھرہ سے، اسے کسی نے اگر یہ بتا دیا کہ فلاں جگہ اچھا گوشت ملتا ہے تو جھٹ سکوٹر کو کک لگائی اور یہ جا وہ جا۔ پہلوان تو شاید دنیا میں آیا ہی گوشت خوری کے لیے تھا۔

وقت کا پہیہ گردش کرتا رہا، شہزاد ایک تعمیراتی فرم کے ساتھ جرمنی چلا گیا۔ باقی دوست بھی اپنے اپنے کاموں میں مصروف ہو گئے۔ شہزاد کی عدم موجودگی میں بھی ماشاء اللہ کڑاہی ہاؤس میں دعوتوں کا سلسلہ چلتا رہا۔ شہزاد سال ڈیڑھ سال کے بعد واپس آتا تو پہلوان کو گوشت کھانے کا ایک اور موقعہ مل جاتا۔ کڑاہی ہاؤس ایک بار پھر قہقہوں سے گونج اٹھتا۔ پہلوان شہزاد کی غیر حاضری میں ہونے والے گوشت خوری کے واقعات کا مزے لے لے کر ذکر کرتا۔ پہلوان سوال کرتا۔

"جرمنی میں کیسا گوشت ملتا ہے؟"

"جرمنی میں حلال گوشت کے لیے کافی تگ ودو کرنا پڑتی ہے۔ گوشت تو ہر جگہ مل جاتا ہے مگر حلال گوشت کے لیے صرف چند دُکانیں ہی مخصوص ہیں۔" دوست اس موقعہ پر لقمہ دیتے۔

"پہلوان جی جرمنی میں ہوتا تو اُسے ہر اس کونے کا پتہ ہوتا جہاں حلال گوشت ملتا ہے۔"

یہ سن کر پہلوان مسکرا دیتا۔ وقت گزرتا رہا۔ سبھی دوست جوانی کے راستے سے گزرتے ہوئے بڑھاپے کی طرف بڑھنے لگے۔ گھریلو ذمہ داریاں، کاروبار اور بچوں کے مستقبل کی فکر نے ان میں نمایاں تبدیلیاں پیدا کر دی تھیں۔ اب بات بات پر قہقہوں کی جگہ سنجیدگی جگہ لیتی جا رہی تھی۔ اعضاء کمزور اور بالوں میں سفیدی بڑھتی جا رہی تھی۔ ماضی کی اس نوجوانوں کی ٹولی کا آپس میں رابطہ بھی بہت دنوں کے بعد ہوتا تھا۔ شہزاد بھی تین چار سالوں میں ایک مرتبہ پاکستان کا چکر لگا لیتا تھا۔

کچھ عرصہ پہلے ہی شہزاد چار سالوں کے بعد پاکستان لوٹا تھا۔ اُس نے سوچا کہ سبھی دوستوں کو ماشاء اللہ کڑاہی ہاؤس جمع کر کے ماضی کو آواز دی جائے۔ دوستوں میں گپ شپ بھی ہو جائے گی اور کچھ کھا پی بھی لیں گے۔ یہ سوچ کر اُس نے پہلوان جی کے فون کا نمبر ملایا۔ چند لمحوں بعد وہ پہلوان جی کے ساتھ گفتگو میں مصروف تھا۔

"پرسوں ماشاء اللہ کڑاہی ہاؤس میں آٹھ بجے رات آجانا۔"

"ماشاء اللہ کڑاہی ہاؤس....." پہلوان جی نے دُہرایا۔

"ہاں آٹھ بجے ماشاء اللہ کڑاہی ہاؤس....."

"میں نہیں آسکوں گا۔"

"وہ کیوں؟" پہلوان جی نے ابھی اس کیوں کا جواب بھی نہیں دیا تھا کہ ان کا رابطہ ٹوٹ گیا۔ شہزاد نے کئی مرتبہ نمبر ڈائل کیا مگر دوبارہ رابطہ نہ ہو سکا۔ شہزاد نے پھر جبار سے رابطہ کیا تو اسے حقیقت کا علم ہوا۔

"پہلوان تو کڑاہی کے نام سے ہی ڈرتا ہے۔"

"آخر کیوں؟" شہزاد پھر سوالیہ نشان بن گیا۔

کیوں کہ اسے گنٹھیا (جوڑوں کا درد) کی بیماری ہو گئی ہے۔ ڈاکٹروں نے اُسے گوشت کھانے سے منع کیا ہے۔ اب تو کافی عرصہ سے ہم کڑاہی ہاؤس نہیں گئے۔ پہلوان کے بغیر کڑاہی کھانے کا مزا ہی نہیں آتا۔"

شہزاد کو پہلوان جی کی بیماری کا جان کر بہت دُکھ ہوا۔ اُسے افسوس ہو رہا تھا کہ اُس نے پہلوان کو کڑاہی کی دعوت ہی کیوں دی تھی۔ پہلوان کے دل پر چوٹ لگی ہو گی۔ چند گھنٹوں بعد وہ پہلوان جی کے سامنے بیٹھا تھا۔ اُسے سمجھ نہیں آرہی تھی کہ بات کہاں سے شروع کرے۔

"پہلوان جی مجھے علم نہیں تھا کہ آپ گنٹھیا کی بیماری میں مبتلا ہیں۔ اگر مجھے پتہ ہوتا تو آپ کو کڑاہی کی دعوت ہر گز نہ دیتا۔ میں شرمندہ ہوں۔"

"یار اس میں تمہاری تو کوئی غلطی نہیں..... بس اب گوشت کھانا میرے مقدر میں نہیں۔"

"کب سے ہے یہ بیماری؟"

"ایک سال ہوگیا، قسم لے لو جو ایک بوٹی بھی منہ کو لگائی ہو۔"

"ایک سال۔" شہزاد نے دُہرایا۔

"ہاں پورا ایک سال..... جوڑوں کے درد کی وجہ سے کہیں کا نہیں رہا۔ دو قدم چلتا ہوں تو درد ہونے لگتا ہے۔ گوشت کو دیکھتا ہوں تو دل سے آہ نکلتی ہے۔ میری وجہ سے بچوں کو بھی گوشت کم ہی ملتا ہے....."

"شہزاد بھائی میں گھر میں اس لیے گوشت نہیں پکاتی کہ یہ آنکھ بچا کر گوشت کھا لیتے ہیں، ڈاکٹر نے انہیں چکن اور مچھلی سے منع نہیں کیا مگر یہ تو مٹن کے شیدائی ہیں۔" پہلوان جی کی بیگم نے کہا۔

"بہت بُری بات..... علاج سے پرہیز بہتر ہے۔ آپ کے لیے گوشت کھانا اچھا نہیں۔ آپ تندرست ہو جائیں گے تو بلاشبہ پہلے کی طرح جی بھر کر گوشت کھایئے گا بلکہ اڑایئے گا۔" شہزاد کی

یہ بات سن کر پہلوان نے ایک ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے کہا۔

"شاید اب ایسا نہ ہو کڑاہی ہاؤس مجھے بلاتا ہے مگر میں وہاں جا نہیں سکتا۔ جبار، ریاض، قمر اور آفتاب تو وہاں جاتے ہیں اور میرے حصے کا بھی گوشت کھا آتے ہیں۔" اس کے بعد تو پہلوان اپنے دوستوں کی اس طرح غیبت کرنے لگا کہ شہزاد کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آرہا تھا۔ اُس کے خیال میں دوستوں میں کوئی بھی تو ایسا نہ تھا جیسا پہلوان بیان کر رہا تھا۔ وہ خاموشی سے اُس کی باتیں سنتا رہا۔ شہزاد جب وہاں سے رخصت ہوا تو اُس کے ذہن پر ایک بوجھ تھا۔ وہ اِسی بوجھ کو اٹھائے گھر پہنچا اور اپنے کمرے میں بند ہو کر رہ گیا۔ پہلوان کی باتوں کی بازگشت اُس کے کانوں میں گونج رہی تھی۔ اپنے دوستوں کے خلاف کی ہوئی بہت سی باتیں اس کے سامنے آن کھڑی ہوئی تھیں۔ اُسے یوں لگ رہا تھا کہ اس کے سبھی دوست کڑاہی ہاؤس کے باہر سلاخوں پر لٹک رہے ہیں اور پہلوان ان کا گوشت کھا رہا ہو۔

"میں پہلوان کو یہ گوشت کھانے سے روکوں گا۔ میں آئندہ اُسے ایسا نہیں کرنے دوں گا،" گوشت کھانا اُس کے لیے زہر کھانے کے برابر ہے۔ میں اُسے یہ زہر نہیں کھانے دوں گا۔"

اس خود کلامی کے بعد شہزاد کچھ کتابوں کو اپنے پاس رکھ کر قلم ہاتھ میں پکڑ کر کاغذ پر جھک گیا۔ وہ تیزی سے کاغذ پر کچھ لکھتا رہا۔ وہ جوں جوں لکھتا جا رہا تھا توں توں اُس کے ذہن سے بوجھ اُترتا جا رہا تھا۔ پھر اُس نے لکھی ہوئی عبارت کو ایک بار پڑھا اور کاغذ کو تہہ کر کے لفافے میں ڈال کر اس پر پہلوان جی کے گھر کا پتہ لکھ دیا۔ اس عمل کے بعد وہ خود کو ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا۔

دُوسرے ہی دن اس کا لکھا ہوا خط پہلوان جی کے ہاتھ میں تھا۔ پہلوان جی نے خط پڑھنا شروع کیا۔ خط میں لکھا تھا۔

اچھے توقیر عرف پہلوان جی! السلام علیکم!

جرمنی سے آکر جب مجھے یہ پتہ چلا تھا کہ ڈاکٹروں نے گنٹھیا کی وجہ سے تمہیں گوشت کھانے سے روک دیا تو مجھے بہت افسوس ہوا تھا کیونکہ تم جیسے گوشت کے رسیا کو گوشت سے دُور رہنا بہت مشکل کام ہے۔ مجھے کل تم سے ملاقات کر کے پتہ چلا کہ تم نے گوشت کھانا ترک نہیں کیا۔ تم انجانے میں یہ عمل کرتے جا رہے ہو۔ یہ سطور پڑھ کر تمہیں یقیناً حیرت کا جھٹکا لگا ہو گا۔ حقیقی دوست وہی ہوتا ہے جو اپنے دوست کی خامیوں سے اُسے آگاہ کرے۔ تم نے کل میرے سامنے بہت سا گوشت کھایا ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ تم دوبارہ اِس طرح کا گوشت کھاؤ۔ ارشاد ربانی ہے۔ "اے ایمان والو بہت گمانوں سے بچو بے شک کوئی گمان گناہ ہو جاتا ہے اور عیب نہ ڈھونڈو اور ایک دُوسرے کی غیبت نہ کرو۔ کیا تم میں کوئی پسند کرے گا کہ اپنے مرے بھائی کا گوشت کھائے تو یہ تمہیں گوارا نہ ہو گا (سورۃ الحجرات آیت: ۱۲)

پہلوان خط پڑھتا جا رہا تھا اور اُس کے ماتھے پر پسینے کے قطروں میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ خط میں شہزاد نے مزید لکھا تھا۔

"حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ کیا تم جانتے ہو کہ غیبت کس کو کہتے ہیں؟ صحابہؓ نے عرض کیا اللہ اور اس کے رسولؐ ہی زیادہ جانتے ہیں۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا اپنے (مسلمان) بھائی (کی غیر موجودگی میں اُس) کے بارے میں ایسی بات کہنا جو اُسے ناگوار گزرے (بس یہی غیبت ہے) کسی نے عرض کیا "اگر میں اپنے بھائی کی کسی ایسی برائی کا ذکر کروں جو واقعتاً اُس میں ہو تو کیا یہ غیبت ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا اگر وہ برائی جو تم بیان کر رہے ہو اُس میں موجود ہے تو تم نے اُس کی غیبت کی اگر وہ برائی جو تم بیان کر رہے ہو اُس میں موجود نہ ہو تو پھر تم نے اُس پر بہتان باندھا۔" پہلوان خط پڑھتا جا رہا تھا اور اُس کی آنکھوں سے ندامت کے آنسو بہتے جاتے تھے۔ خط کے آخر میں بائیں طرف لکھا تھا "فقط تمہارا حقیقی دوست..... شہزاد۔"

"شہزاد واقعی تم میرے حقیقی دوست ہو..... مجھ سے انجانے میں جو غلطی ہوتی رہی ہے وہ غلطی میں دوبارہ نہیں کروں گا، میں گوشت نہیں کھاؤں گا۔ یہ خط میرے لئے روشنی بن کر آیا ہے۔"

یہ کہہ کر پہلوان جی نے شہزاد کا خط چوم کر سینے سے لگا لیا۔

ہونہار مصور

تصاویر صرف افقی رُخ میں ہی بنائیں

طلوع آفتاب کا منظر

بنت تحسین سرور، لاہور (پہلا انعام: 175 روپے کی کتب)

سیدہ فریحہ رضوان، واہ کینٹ (دوسرا انعام: 150 روپے کی کتب)

محمد احمد جاوید، شرق پور (تیسرا انعام: 125 روپے کی کتب)

انس نسیم خان، کراچی (چوتھا انعام: 100 روپے کی کتب)

آمنہ ذوالفقار، گوٹھ ماچھی (پانچواں انعام: 90 روپے کی کتب)

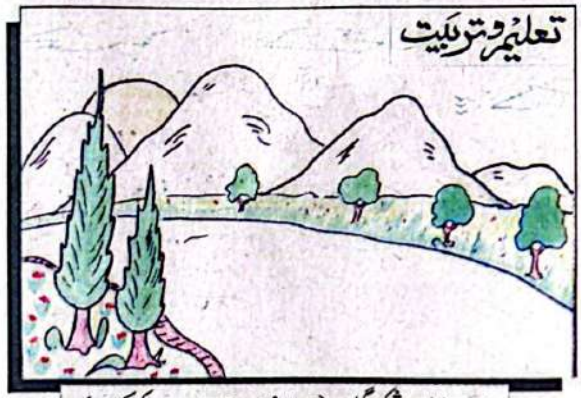

سامعہ خالد، شکر گڑھ (چھٹا انعام: 75 روپے کی کتب)

کچھ اچھے مصوروں کے نام بہ ذریعہ قرعہ اندازی: ثناء جمال اسلام آباد۔ ضحیٰ جاوید شرق پور۔ سلطان فاروقی، نازیہ نذیر قصور۔ قرۃ العین اوکاڑا۔ محمد عثمان قاسمی جھنگ۔ محمد جعفر صادق وہاڑی۔ ماریہ ناز کامرہ۔ آسیہ نواز سرگودھا۔ مزمل، محسن خان، حسنہ رحمان، فخر، گوٹھ ماچھی۔ شبانہ گل مردان۔ میمونہ مقدس، عبدالرحمٰن، زکیہ بانو ساہی وال۔ رحما سعدیہ قلعہ دیدار سنگھ۔ ارسلان علی تلہ گنگ۔ سیدہ نادیہ یاسمین کراچی۔ ثوبیہ انجم آزاد کشمیر۔ اسامہ رفیق فیصل آباد۔ طیبہ طفیل گوجرانوالہ۔ زینب شفیع محمد لسبیلہ۔ فواد الحسن، مدیحہ زینب جہلم۔ جہانزیب خان، بنوں۔ لائبہ اشفاق پشاور۔ ربیعہ رشید ننکانہ صاحب۔

ہدایات: تصویر 6 انچ چوڑی، 9 انچ لمبی اور رنگین ہو۔ تصویر کی پشت پر مصور اپنا نام، عمر، کلاس اور پورا پتا لکھے اور سکول کے پرنسپل یا ہیڈ مسٹریس سے تصدیق کروائے کہ تصویر اسی نے بنائی ہے۔

آخری تاریخ 8 جون

جولائی کا موضوع: چاند اور ستارے

آخری تاریخ 8 جولائی

اگست کا موضوع: پرچم پاکستان کا

میری زندگی کے مقاصد

محمد سعد عبداللہ، گوجرانوالہ

میں ریسکیو 1122 میں جا کر ملک و قوم کی خدمت کرنا چاہتا ہوں۔

محمد علی زین، لاہور

میں وکیل بن کر اپنے ملک کا اور والدین کا نام روشن کروں گا۔

لائبہ شاہد، لاہور

میں بڑی ہو کر پائلٹ بن کر اپنے ملک کی سرحدوں کی حفاظت کرنا چاہتی ہوں۔

محمد شایان ظفر، لاہور

میں انجینئر بن کر دُنیا میں پاکستان کا نام روشن کروں گا۔

محمد عبداللہ خان، اسلام آباد

اپنے لیے تو سبھی جیتے ہیں اس جہاں میں زندگی کا مقصد ہے اوروں کے کام آنا۔

حفظہ، کراچی

میں بڑا ہو کر ڈاکٹر بنوں گا اور اپنے والدین کا نام روشن کروں گا۔

فرزا اسلم، لاہور

میں بڑا ہو کر سائنس دان بن کر ملک کا نام روشن کرنا چاہتا ہوں۔

رمونا لطیف، لاہور

میں ایک سچی اور نیک مسلمان بننا چاہتی ہوں اور اسلام کی تبلیغ کرنا چاہتی ہوں۔

محمد عمیر عمران، جہلم

میں پہلے حافظِ قرآن بنوں گا اور پھر پاک نیوی میں جا کر ملک و قوم کے لیے خدمات انجام دوں گا۔

ردا عابد، کراچی

میں بڑی ہو کر آرٹسٹ بنوں گی اور آرٹ کی ترقی کے لیے کام کروں گی۔

حاشر احمد، کراچی

میں بڑا ہو کر آرٹسٹ بن کر اپنے ملک اور والدین کا نام روشن کروں گا۔

شہریار حیدر، جہلم

میں ڈاکٹر بن کر غریبوں کا مفت علاج کروں گا۔

عماد احمد، لاہور

میں قرآن مجید حفظ کر کے عالم دین بننا چاہتا ہوں اور اسلام کو پوری دُنیا میں پھیلانا چاہتا ہوں۔

شعیب اختر، لاہور

میں ڈاکٹر بن کر دکھی انسانیت کی خدمت کروں گا۔

انیقہ ادریس، لاہور

میں بڑی ہو کر ڈاکٹر بنوں گی اور غریبوں کا مفت علاج کروں گی۔

علی فیضان، حویلی لکھا

میں بڑا ہو کر فوجی بنوں گا اور اپنے ملک کی حفاظت کروں گا۔

طلحہ صدیقی، لاہور

میں حافظِ قرآن بن کر اسلام کی سربلندی کے لیے اپنی زندگی وقف کرنا چاہتا ہوں۔

عبداللہ نوید، اسلام آباد

میری زندگی کا مقصد یہ ہے کہ میں ڈاکٹر بن کر غریبوں کا مفت علاج کروں گا۔

محمد سعد، لاہور

میں آرمی میں جا کر قوم کی خدمت کرنا چاہتا ہوں۔

منیبہ فیاض، اسلام آباد

میں بڑی ہو کر ڈاکٹر بنوں گی اور غریبوں کا مفت علاج کروں گی۔

سمیرا ایجاز، کراچی

میری زندگی کا مقصد یہ ہے کہ میں بڑا ہو کر سائنس دان بنوں اور نئی نئی چیزیں ایجاد کروں۔

میری زندگی کے مقاصد کے لیے یہ کوپن پُر کرنا اور پاسپورٹ سائز رنگین تصویر بھیجنا ضروری ہے۔

نام ..... شہر .....

مقاصد .....

.....

بلاعنوان

اس تصویر کا اچھا سا عنوان تجویز کیجئے اور 500 روپے کی کتب لیجئے۔
عنوان بھیجنے کی آخری تاریخ 10 جون 2010ء ہے۔

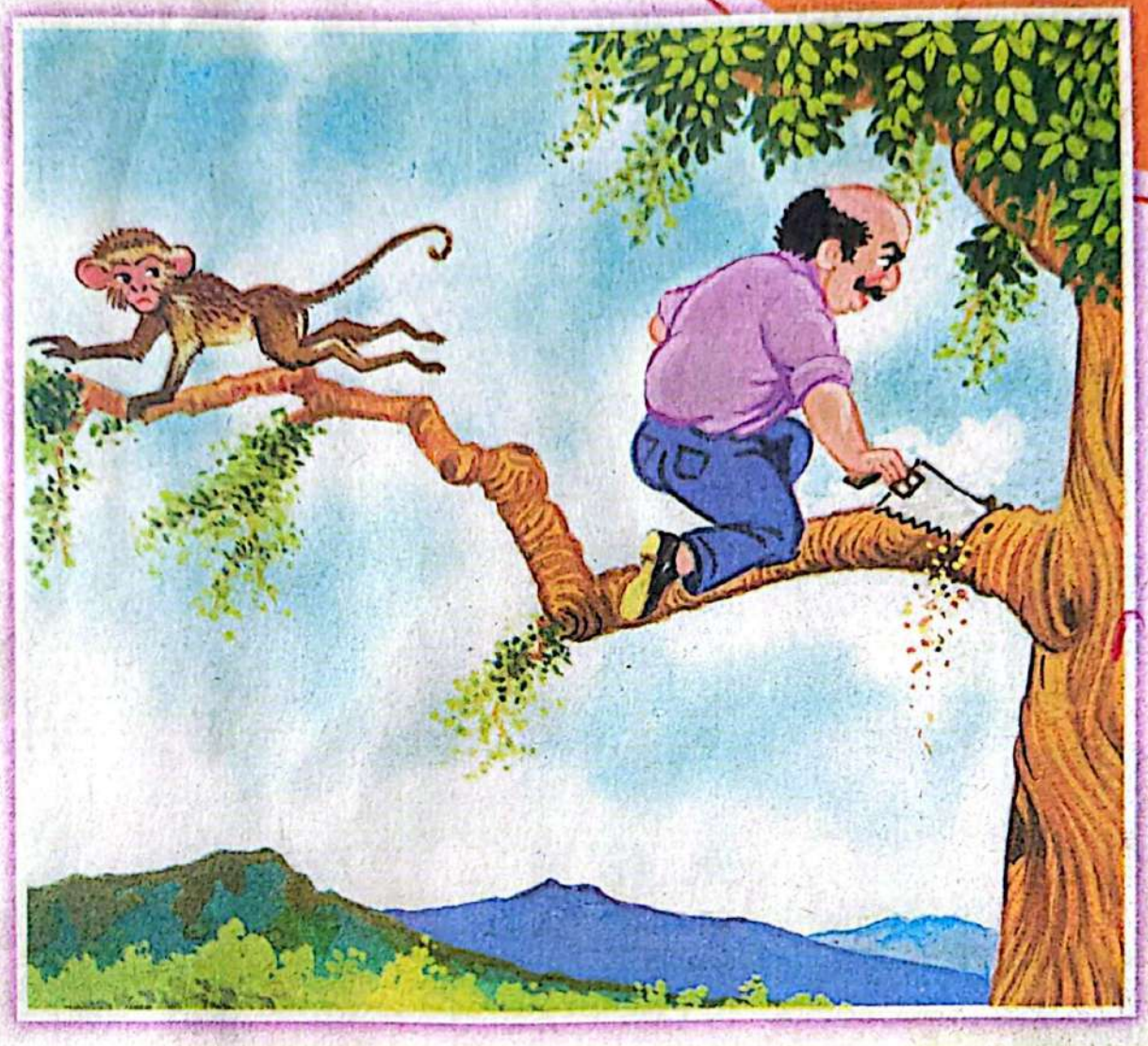

مئی 2010ء کے "بلاعنوان کارٹون" کے لیے ہزاروں عنوانات موصول ہوئے، جن میں سے مجلسِ ادارت کو 200 عنوانات پسند آئے اور یہ ساتھی بہ ذریعہ قرعہ اندازی 500 روپے کی کتب کے انعامات کے حق دار قرار پائے۔

☆ وجیہہ زبیر، کراچی (تھری اِن ون)

☆ محمد بن عظمت، راول پنڈی (تین اور ایک برابر ہوتے ہیں۔)

☆ قراۃ العین خنسا، اوکاڑا (ایک بٹہ تین، دیکھو ہماری سکیم)

☆ نمرہ اقبال، کراچی (کیسی رہی ترکیب)

☆ تحریم معراج، لاہور (ہم کسی سے کم نہیں)

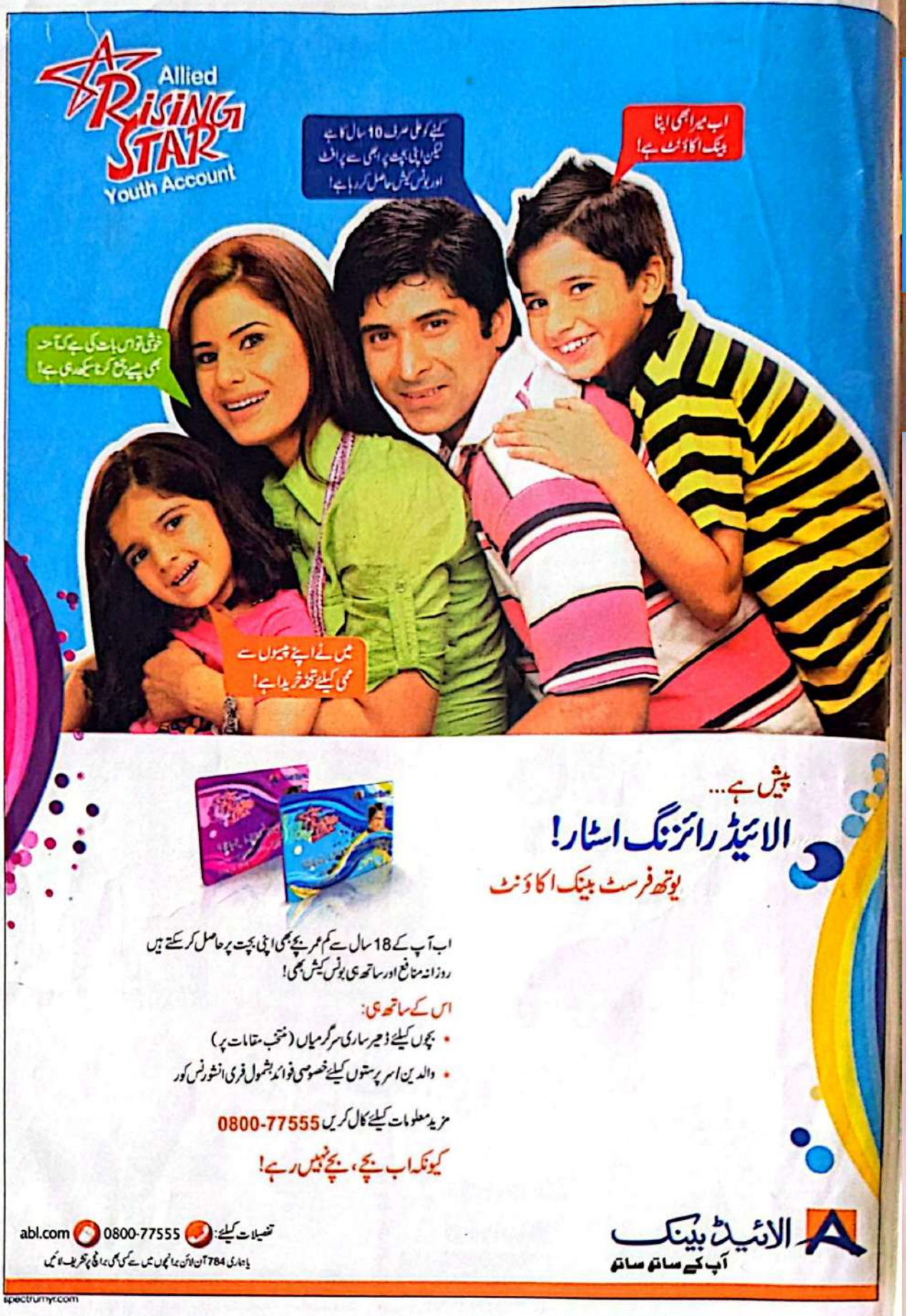
Allied
Rising Star
Youth Account
کہنے کو عمر صرف 10 سال کا ہے
لیکن اپنی بچت پر ابھی سے پرافٹ
اور بونس کیش حاصل کر رہا ہے!
اب میرا بھی اپنا
بینک اکاؤنٹ ہے!
خوشی تو اس بات کی ہے کہ آج
بھی پیسے جمع کرنا سیکھ رہی ہے!
میں نے اپنے پیسوں سے
ممی کیلئے تحفہ خریدا ہے!

پیش ہے...

الائیڈ رائزنگ اسٹار!

یوتھ فرسٹ بینک اکاؤنٹ

اب آپ کے 18 سال سے کم عمر بچے بھی اپنی بچت پر حاصل کر سکتے ہیں
روزانہ منافع اور ساتھ ہی بونس کیش بھی!

اس کے ساتھ ہی:

- بچوں کیلئے ڈھیر ساری سرگرمیاں (منتخب مقامات پر)
- والدین/سرپرستوں کیلئے خصوصی فوائد بشمول فری انشورنس کور

مزید معلومات کیلئے کال کریں 0800-77555

کیونکہ اب بچے، بچے نہیں رہے!

الائیڈ بینک
آپ کے ساتھ ساتھ

تفصیلات کیلئے: 0800-77555 abl.com

یا اپنی 784 آن لائن برانچوں میں سے کسی بھی برانچ پر تشریف لائیں

spectrum.pk.com

لذائیت... ذائقہ... معیار...

Shangrila®
Takes the Taste...
...to the Limits

Brands of the year Award 2009
IT'S ALL ABOUT CHAMPIONS
KETCHUP & SAUCES
Consecutively Winner
for the years 2008 & 2009

Consumer Choice Award
For 2005, 2006, 2007 & 2008

Pakistan's First Company Awarded
HALAAL Certification By
South African National Halaal Authority

ISO 9001:2000 Certified

www.shangrila.com.pk